ذوالحجہ ۱۴۳۵ھ
اکتوبر ۲۰۱۴ء

# ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
**تنظیمِ اسلامی**
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

- اطاعتِ اَمر بمقابلہ تنازُع فی الاَمر
- اخلاصِ نیّت اور ریاکاری
- دُنیا کا دھوکہ اور راہِ اعتدال


داعی رجوع الی القرآن بانی تنظیم اسلامی
محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

## بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

حصہ اول سُورۃ الفاتحہ و سُورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن
(نواں ایڈیشن) ——— صفحات: 360، قیمت 475 روپے

حصہ دوم سُورۃ آلِ عمران تا سُورۃ المائدہ
(چھٹا ایڈیشن) ——— صفحات 321، قیمت 425 روپے

حصہ سوم سُورۃ الانعام تا سُورۃ التوبہ
(پانچواں ایڈیشن) ——— صفحات 331، قیمت 425 روپے

حصہ چہارم سُورۃ یُونس تا سُورۃ الکہف
(چوتھا ایڈیشن) ——— صفحات 394، قیمت 475 روپے

حصہ پنجم سُورۃ مریم تا سُورۃ السّجدۃ
(تیسرا ایڈیشن) ——— صفحات 480، قیمت 575 روپے

حصہ ششم سُورۃ الاحزاب تا سُورۃ الحجرات
(پہلا ایڈیشن) ——— صفحات 484، قیمت 590 روپے

ملنے کے پتے

انجمن خُدّام القرآن خیبر پختونخوا، پشاور
A-18 ناصر مینشن، ریلوے روڈ نمبر 2 شعبہ بازار پشاور، فون: (091)2584824,2214495

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون (042)35869501-3

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

# ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد : 63

شمارہ : 10

ذوالحجہ 1435ھ

اکتوبر 2014ء

فی شمارہ -/25

مُدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِتعاون

- اندرونِ ملک 250 روپے
- بھارت وبنگلہ دیش 900 روپے
- ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ 1200 روپے
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ 1500 روپے

ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700، فون: 3-35869501
فیکس: 35834000، ای میل: maktaba@tanzeem.org
ای میل برائے ادارتی امور: publications@tanzeem.org
ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور
فون: 36366638 - 36316638 فیکس: 36313131
پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ




# مشمولات


**عرضِ احوال** — 5
سازش — ایوب بیگ مرزا

**بیانُ القرآن** — 9
سورۃ الکھف (آیات ۲۷ تا ۴۹) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

**تفہیمُ القرآن** — 27
یَوْمُ التَّغَابُن — مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

**منتخب نصاب ۲** — 31
اطاعت امر بمقابلہ تنازع فی الامر — انجینئر حافظ نوید احمد

**حقیقتِ دین** — 46
اخلاصِ نیت اور ریاکاری — جمیل الرحمٰن عباسی

**صراطِ مستقیم** — 63
دنیا کا دھوکہ اور راہِ اعتدال — حافظ انجینئر عمیر انور

**حسنِ عبادت** — 79
قیام اللّیل (تہجد) کی فضیلت — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

**جدتِ کردار** — 83
مولانا ظفر علی خانؒ کا قرآن مجید سے شغف — حافظ محمد مشتاق ربانی

**یادِ رفتگاں** — 89
میرے والدِ گرامی — عامر عتیق صدیقی

**بحث و نظر** — 91
ذوالقرنین، سدِ ذوالقرنین اور یاجوج ماجوج (۲) — شاہین عطر جنجوعہ

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

# سازش

ایک عرصہ سے پاکستان میں جو لفظ سب سے زیادہ تحریر و تقریر میں آ رہا ہے وہ ہے ’’سازش‘‘۔ اخبارات کے اداریہ نویس ہوں یا کالم نگار‘ نیوز چینل کے ٹاک شوز کے مہمان ہوں یا سیاسی جلسوں کے مقررین‘ سب سازش تھیوری بیان کر رہے ہیں یا تحریر میں لا رہے ہیں۔ حکومت کہتی ہے ہمارے خلاف سازش ہو رہی ہے‘ فوج بھی سازش کا تاثر دیتی ہے۔ اور اس بات پر تو اہل پاکستان بالعموم متفق ہیں کہ دنیا کو پاکستان کے خلاف سازشیں کرنے کے سوا کوئی کام نہیں۔ یہ یہودی سازش ہے‘ یہ انٹرنیشنل سازش ہے۔ کوئی زلزلہ آئے‘ کوئی سیلاب آئے‘ کوئی تحریک چلے اور فرقہ وارانہ فسادات کی لہر اٹھ جائے‘ بعض اوقات تو مقامی سطح پر کوئی بڑی خرابی پیدا ہو جائے‘ تو یہ بھی پاکستان کے خلاف عالمی سازش قرار دے دی جاتی ہے۔ ہم سازشوں کا ہرگز ہرگز انکار نہیں کرتے۔ ہم خود ان سطور میں بعض عالمی سازشوں کی نشان دہی کر چکے ہیں۔ ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم اس حوالہ سے بڑی مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہیں۔ سنی سنائی باتوں کو مرچ مصالحہ لگا کر آگے بڑھاتے ہیں۔ افواہ سازی‘ سنسنی خیزی اور اضطراب کی کیفیت پیدا کرنا ہمارا قومی رویہ بن گیا ہے۔ یہ تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ بیماری کیوں پیدا ہوئی‘ روز بروز اس میں شدت کیوں پیدا ہو رہی ہے اور ہم ہر وقت سازش ہوتی کیوں دیکھتے رہتے ہیں؟

پاکستان کے قیام کو سڑسٹھ (67) سال ہو چکے ہیں۔ اس مدت کو ہم اگر یوں دو حصوں میں تقسیم کریں کہ 1947ء سے 1969ء کے دور کو یعنی قائداعظم اور لیاقت علی خاں کے دور سے لے کر ایوب خان کے زوال تک کو پہلا حصہ قرار دیں اور 1969ء سے آج تک کے دور کو دوسرا حصہ قرار دیں تو اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پہلا دور ترقی کا دور تھا اور دوسرا زوال کا دور تھا‘ جو آج تک جاری ہے۔ البتہ ہمیں زوال کو بھی دو حصوں میں تقسیم کرنا ہوگا۔ 1969ء سے بیسویں صدی کے اواخر تک زوال میں زیادہ تیزی نہیں تھی‘ حالانکہ ملک دولخت



ہوا تھا‘ بھارت کے ہاتھوں ہم نے بدترین عسکری شکست کھائی تھی‘ فوج کا مورال بدترین سطح پر تھا‘ سیاسی سطح پر ہم سر اٹھانے کے قابل نہ تھے‘ اقتصادی سطح پر بنگلہ دیش کے آزاد ہونے کی وجہ سے ہم پٹ سن کے سنہری ریشوں سے محروم ہو گئے تھے۔ لیکن پھر بھی ملک سنبھالا گیا۔ افغانستان میں سوویت یونین کی شکست نے پاکستان کے امیج کو بہتر کیا۔ اقتصادی حالت بھی بہتر ہوئی تھی۔ لیکن بعض دوسرے حوالوں سے پاکستان کو شدید نقصان پہنچا‘ جن کی تفصیل اس وقت ہمارا موضوع نہیں۔ بہرحال پاکستان مجموعی طور پر زوال کا سفر طے کرتا چلا گیا۔ اکیسویں صدی کے آغاز سے ہمارے زوال کی تیزی کا معاملہ کچھ یوں ہو گیا جیسے کوئی پہاڑ سے لڑھک رہا ہو اور اس وقت‘ کوئی مانے یا نہ مانے پاکستان ایک ناکام ریاست ہے۔ بعض عالمی قوتوں کا مفاد اس میں ہے کہ ابھی یعنی فی الحال ہمیں ناکام ریاست ڈکلیئر نہ کیا جائے‘ لہٰذا پاکستان فی الحال اعلانیہ ناکام ریاست نہیں ہے۔

یہ بات نوٹ کی جانی چاہیے کہ 1969ء سے پہلے جب ہم کم از کم دُنیوی سطح پر ترقی کا سفر طے کر رہے تھے ’’سازش‘‘ کا لفظ سننے میں نہیں آیا تھا۔ ان دنوں میں پاکستان‘ بھارت ہی نہیں‘ خطہ میں تمام دوسرے ممالک پر سبقت لیے ہوئے تھا۔ پاکستان کی کرنسی کی ویلیو بھارت سے قریباً دگنی تھی۔ 1965ء میں بھارتی فوج کو ناکوں چنے چبوانے پر ہر پاکستانی کا سر فخر سے بلند تھا۔ پاکستان کی فوج کو دنیا کی بہترین پروفیشنل افواج میں سے ایک سمجھا جاتا تھا۔ آج جب ہماری فوج کافی حد تک پروفیشنل نہیں رہی اور وہ بری طرح politicise ہو گئی ہے یا کر دی گئی ہے تو امریکہ ہی نہیں بھارت بھی ہماری سرحدوں کی بے حرمتی کر رہا ہے اور ہماری فضائیں بھی ہمارے کنٹرول میں نہیں۔ اقتصادی لحاظ سے ہم دیوالیہ ہو چکے ہیں۔ اندرونی و بیرونی قرضوں میں ہم بری طرح جکڑے ہوئے ہیں۔ سیاسی آوارگی ہمارا مقدر محسوس ہوتی ہے۔ اخلاقی قدروں کا جنازہ نکل چکا ہے۔ عالمی برادری میں ہماری حالت وہی ہے جو محلے میں اَن پڑھ‘ آوارہ‘ بدتمیز اور بداخلاق لڑکے کی ہوتی ہے۔ لیکن ہم اپنی نااہلیوں‘ نالائقیوں اور قومی سطح پر بدعملیوں پر نگاہ ڈالنے کی بجائے اپنے دل اور ذہن کو مطمئن کرنے کے لیے باآوازِ بلند سازش سازش کا شور و غوغا کرنے میں مصروف ہیں۔ گویا ہم ابھی بھی اس طرف توجہ دینے کے لیے تیار نہیں کہ اپنی اصلاح کر کے اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں سے نجات حاصل کر کے ہم ایک بار پھر باوقار اور باعزت قوم بننے کی کوشش کریں اور عالمی سطح پر ایک اچھا مقام حاصل

کرسکیں‘ بلکہ ہم ’’سازش‘‘ کے لفظ میں پناہ لے کر خود کو بریٔ الذمہ ٹھہرانا چاہتے ہیں۔ ہمارا کوئی قصور نہیں‘ ہمارے خلاف سازش ہو رہی ہے۔ گویا ہم اس شکست کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں جو ہمیں عالمی برادری میں ہوئی ہے۔ ہم حیلے اور بہانے تراش رہے ہیں‘ اور جب کوئی فرد‘ معاشرہ یا ریاست اپنی غلطی اور کوتاہی کو ہی نہ مانے تو وہ اپنی اصلاح کیسے کرے گی؟ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ معاشرے غلطیوں سے نہیں غلطیوں کے اصرار پر تباہ ہوتے ہیں۔

آئیے اب یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ پاکستانی معاشرہ سیاسی‘ سماجی اور اقتصادی طور پر ایک پسماندہ اور شکست خوردہ معاشرہ کیوں ہے؟ انسانی جِدّوجُہد اور کوشش کی تین جہتیں ہیں یا تین دائروں میں کی جا سکتی ہے: (1) ذاتی یعنی اپنے لیے (2) قومی یعنی اپنی قوم کے لیے (3) دینی یعنی اپنی آخرت کی کامیابی کے لیے۔ اللہ ربّ العزت کی سنت یہ ہے کہ انسان جس رخ پر محنت اور کوشش کرتا ہے اس کے لیے اسی طرف کے راستے کشادہ کرتا چلا جاتا ہے۔

دنیا آج عمومی طور پر وطن پرستی کے شرک میں مبتلا ہے‘ وطن ہی معبود ہے‘ اس کے چرنوں میں غیروں کی جان اور مال کی قربانی پیش کی جائے گی‘ وطن کا مفاد ہو تو غیر ملک اور غیر قوم سے دھوکہ‘ فریب‘ بدعہدی‘ قتل و غارت گری سب کچھ عبادت میں شمار ہوتا ہے۔ یورپ‘ امریکہ‘ جاپان وغیرہ میں لوگوں کی بھاری اکثریت اپنے ذاتی مفادات پر بھی قومی مفادات کو ترجیح دیتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وطن اور قوم مضبوط ہوئے۔ ہم پاکستانیوں نے صرف اور صرف اپنی ذات پر توجہ دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ افراد‘ امیر‘ توانا اور خوشحال ہوئے اور قوم غریب و بدحال ہوئی۔ آخرت سے ہم نے جزوی اور انفرادی سطح پر رشتہ کسی حد تک جوڑا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مساجد ایک سے ایک خوبصورت تعمیر ہوئیں۔ حج اور عمرہ کے لیے قطاریں لگ گئیں‘ لیکن دین اور ریاست میں تعلق قائم نہ ہو سکا۔ لہٰذا ریاست کے حوالے سے پاکستان دنیا اور آخرت میں خسارے کی عبرت ناک مثال ہے۔ پاکستان کے مسلمانوں نے اپنی خوش قسمتی کو بدقسمتی میں بدل لیا ہے۔ اس لیے کہ یہ ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے اس کی دنیوی ترقی کے لیے بھی اسلام ہی بنیاد بن سکتا تھا‘ لیکن ہم نے ریاستی سطح پر اسلام کو ملک بدر کر دیا‘ جس سے خلا پیدا ہوا‘ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پہلے ملک دولخت ہوا۔ صوبائی‘ لسانی تعصبات یہ خلا پُر کرنے لگے‘ فرقہ واریت نے جنم لیا‘ جس سے یہ ملک جہنم بنتا جا رہا ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنی پسماندگی اور شکست کو سازش کے پردے میں نہ



چھپائیں۔ ہر فرد اپنے گریبان میں منہ ڈالے۔ مذہب اسلام سے ہی نہیں بلکہ دینِ اسلام سے بھی اپنے تعلق کا جائزہ لے اور اسے مضبوط کرے۔ قرآن پاک کو اپنا امام بنائے اور سنتِ رسول ﷺ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے اور پاکستان میں اقامتِ دین کی جِدّوجُہد کے لیے کسی مخلص تنظیم سے خود کو باندھ لے —— لیکن ایک بات کبھی فراموش نہ کرے کہ تمام تر جِدّوجُہد کا اصل مقصد اور ہدف رضائے الٰہی ہو۔ اقامتِ دین کی جِدّوجُہد اس کے حصول کا بہترین اور اعلیٰ سطح کا ایک ذریعہ ہے۔ جذبہ اور خلوص ہو تو دنیا میں بھی منزل حاصل ہو سکتی ہے‘ البتہ اُخروی کامیابی کی تو اللہ ربّ العزت خود ضمانت دیتا ہے۔

آخری اور حتمی بات یہ کہ جو فرد دین اور آخرت کو ترجیح دیتے ہوئے آخرت کی کامیابی کے لیے جدّوجہد کرتا ہے تو گویا وہ تینوں سمتوں میں مصروفِ کار ہے۔ اللہ ربّ العزت نے اس صورتِ حال کو اپنی مقدس کتاب میں کس خوبصورتی کے ساتھ واضح کیا ہے:

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿١٨﴾ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿١٩﴾﴾ (بنی اسرائیل)

’’جو شخص دنیا (کی آسودگی) کا خواہش مند ہو تو ہم اس میں سے جسے چاہتے ہیں اور جتنا چاہتے ہیں جلد دے دیتے ہیں‘ پھر اس کے لیے جہنم کو (ٹھکانہ) مقرر کر رکھا ہے‘ جس میں وہ نفرین سن کر اور (اللہ کی درگاہ سے) راندہ ہو کر داخل ہو گا۔ اور جو شخص آخرت کا خواستگار ہو اور اس میں اتنی کوشش کرے جتنی اسے لائق ہے اور وہ مؤمن بھی ہو تو ایسے ہی لوگوں کی کوشش ٹھکانے لگتی ہے۔‘‘

قصہ کوتاہ‘ اگر ہم اسلام کو بحیثیت دین پاکستان میں نافذ کر دیتے‘ عمارت صحیح بنیادوں پر کھڑی ہوتی تو فرد بھی خوشحال ہوتا اور قوم بھی مضبوط اور توانا ہوتی اور آخرت بھی سنور جاتی۔ اب بھی موقع ہے کہ ہم سازش سازش گردان چھوڑ دیں‘ اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کو پاکستان میں نافذ کریں۔ سازشیں پھر بھی ہوں گی‘ لیکن وہ اسلام کی اس فصیل سے ٹکرا کر دم توڑ جائیں گی جو آپ نے اپنے گرد مضبوطی سے تعمیر کر لی ہوگی۔ ۞۞۞

میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

# سُورۃُ الکَھف

## آیات ۲۷ تا ۳۱

وَاتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ کِتٰبِ رَبِّکَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ ۚ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ
دُوْنِہٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۷﴾ وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَدٰوۃِ
وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْھَہٗ وَلَا تَعْدُ عَیْنٰکَ عَنْھُمْ ۚ تُرِیْدُ زِیْنَۃَ الْحَیٰوۃِ
الدُّنْیَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَہٗ عَنْ ذِکْرِنَا وَاتَّبَعَ ھَوٰىہُ وَکَانَ اَمْرُہٗ
فُرُطًا ﴿۲۸﴾ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّکُمْ ۟ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ ۙ
اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِیْنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِھِمْ سُرَادِقُھَا ؕ وَاِنْ یَّسْتَغِیْثُوْا یُغَاثُوْا بِمَآءٍ
کَالْمُھْلِ یَشْوِی الْوُجُوْہَ ؕ بِئْسَ الشَّرَابُ ؕ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۲۹﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِیْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ﴿۳۰﴾ ۚ اُولٰٓئِکَ لَھُمْ
جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھِمُ الْاَنْھٰرُ یُحَلَّوْنَ فِیْھَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَھَبٍ
وَّیَلْبَسُوْنَ ثِیَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَّکِئِیْنَ فِیْھَا عَلَی
الْاَرَآئِکِ ؕ نِعْمَ الثَّوَابُ ؕ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۳۱﴾ ۧ

**آیت ۲۷** ﴿وَاتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ کِتَابِ رَبِّکَ ۚ﴾ ”اور (اے نبی ﷺ!) آپ تلاوت کیجیے جو آپ کی طرف وحی کی گئی ہے آپ کے رب کی کتاب میں سے۔“

یعنی اس وقت آپؐ بہت مشکل صورتِ حال کا سامنا کر رہے ہیں۔ اس کیفیت میں آپؐ کو صبر واستقامت کی سخت ضرورت ہے: ﴿وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُکَ اِلَّا بِاللّٰہِ﴾ (النحل: ۱۲۷) ”اور (اے نبی ﷺ!) آپ صبر کیجیے اور آپ کا صبر تو اللہ کے سہارے پر ہی ہے“۔ یہ سہارا



آپؐ کو اللہ کے ساتھ اپنا قلبی تعلق اور ذہنی رشتہ استوار کرنے سے میسر ہوگا اور یہ تعلق مضبوط کرنے کا سب سے مؤثر ذریعہ قرآن مجید کی تلاوت ہے۔ تمسک بالقرآن کا یہ مضمون سورۃ العنکبوت میں (اکیسویں پارے کے آغاز میں) دوبارہ آئے گا۔ حق و باطل کی کشمکش میں جب بھی کوئی مشکل وقت آیا تو رسول اللہ ﷺ کو خصوصی طور پر تمسک بالقرآن کی ہدایت کی گئی‘ اور آپؐ کی وساطت سے تمام مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ قرآن کی تلاوت کو اپنا معمول بنائیں‘ قرآن کے ساتھ اپنا تعلق مضبوط بنانے کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت اس کے ساتھ صرف کریں۔ اسی طرح وہ مشکلات وشدائد کو برداشت کرنے اور اپنے دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوسکیں گے۔

﴿لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ ۚ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِہٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۷﴾﴾ ”اُس کی باتوں کو بدلنے والا کوئی نہیں ہے‘ اور آپؐ نہیں پائیں گے اُس کے سوا کوئی جائے پناہ۔“

یقیناً یہ راستہ بہت کٹھن ہے اور اس راستہ کے مسافروں نے سختیوں کو بہرحال برداشت کرنا ہے۔ یہ اللہ کا قانون ہے جو کسی کے لیے تبدیل نہیں کیا جاتا۔ اس مہم میں واحد سہارا اللہ کی مدد اور نصرت ہے۔ چنانچہ اگر آپؐ کو کہیں پناہ ملے گی تو اللہ ہی کے دامن میں ملے گی‘ اُس در کے علاوہ کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔ علامہ اقبالؔ نے اسی مضمون کی ترجمانی اپنے اس شعر میں کی ہے: ؎

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی‘ جو اماں ملی تو کہاں ملی
میرے جرمِ خانہ خراب کو‘ تیرے عفو بندہ نواز میں!

**آیت ۲۸** ﴿وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَدٰوۃِ وَالْعَشِیِّ﴾ ”اور اپنے آپ کو روکے رکھیے اُن لوگوں کے ساتھ جو اپنے رب کو پکارتے ہیں صبح وشام“

یہ بلال حبشی‘ عبداللہ بن اُمِّ مکتوم‘ عمار بن یاسر اور خباب رضی اللہ عنہم جیسے لوگ اگرچہ مفلس اور نادار ہیں مگر اللہ کی نظر میں بہت اہم ہیں۔ آپؐ ان لوگوں کی رفاقت کو غنیمت سمجھیے اور اپنے دل کو ان لوگوں کی معیت پر مطمئن کیجیے۔

﴿یُرِیْدُوْنَ وَجْھَہٗ وَلَا تَعْدُ عَیْنٰکَ عَنْھُمْ ۚ تُرِیْدُ زِیْنَۃَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ۚ﴾ ”وہ اللہ کی رضا کے طالب ہیں اور آپؐ کی نگاہیں ان سے ہٹنے نہ پائیں‘ (جس سے لوگوں کو یہ گمان ہونے لگے کہ) آپؐ دُنیوی زندگی کی آرائش وزیبائش چاہتے ہیں!“

ان غلاموں اور بے آسرا لوگوں سے آپؐ کی توجہ ہٹ کر کہیں مکہ کے سرداروں اور امراء کی طرف نہ ہونے پائے‘ جس سے لوگوں کو یہ گمان ہو کہ آپؐ بھی دنیا کی زیب وزینت ہی کو اہمیت دیتے ہیں۔ لہٰذا ولید بن مغیرہ بظاہر کتنا ہی بااثر اور صاحب ثروت سہی‘ آپؐ عبداللہؓ بن اُمِّ مکتوم کو نظر انداز کر کے اُسے ہرگز اہمیت نہ دیں۔ ترجمہ کے اعتبار سے یہ آیت مشکل آیات میں سے ہے۔ یہاں الفاظ کے عین مطابق ترجمہ ممکن نہیں۔ حضورﷺ کی یہ شان ہرگز نہ تھی کہ آپﷺ کی نظریں غرباء سے ہٹ کر امراء کی طرف اُٹھتیں۔ چنانچہ ان الفاظ سے یہی مفہوم سمجھ میں آتا ہے کہ دراصل آپؐ کو یہ بتانا مقصود ہے کہ آپؐ دعوت وتبلیغ کی غرض سے بھی ان امراء کی طرف اس انداز میں التفات نہ فرمائیں جس سے کسی کو مغالطہ ہو کہ آپﷺ کی نگاہ میں دُنیوی مال واسباب کی بھی کچھ وقعت اور اہمیت ہے۔ سورۃ الحجر میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے: ﴿لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٨٨﴾﴾ ’’آپؐ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھیں اس مال ومتاع کی طرف جو ہم نے ان کے مختلف گروہوں کو دے رکھا ہے اور آپؐ ان (امراء) کے بارے میں فکرمند نہ ہوں اور اہل ایمان کے لیے اپنے بازو جھکا کر رکھیں!‘‘

کسی بھی داعیٔ حق کے لیے یہ معاملہ بہت نازک ہوتا ہے۔ معاشرے کے اونچے طبقے کے لوگوں کا بہرحال اپنا ایک حلقہ اثر ہوتا ہے۔ ان میں سے اگر کوئی اہل حق کی صف میں شامل ہوتا ہے تو وہ اکیلا بہت سے افراد کے برابر شمار ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے کئی دوسرے لوگ خود بخود کھنچے آتے ہیں اور پہلے سے موجود لوگوں کے لیے بھی ایسے شخص کی شمولیت تقویت اور اطمینان کا باعث ہوتی ہے۔ جیسے حضورﷺ نے اللہ تعالیٰ سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ عمرؓ بن الخطاب یا عمرو بن ہشام (ابوجہل) میں سے کسی ایک کو ضرور میری جھولی میں ڈال دے! ان دونوں میں سے کوئی ایک ایمان لے آئے۔ ظاہر ہے کہ ان جیسی بااثر شخصیات میں سے کسی کا ایمان لانا اسلام کے لیے باعثِ تقویت ہوگا اور اس کی رفاقت سے ان کمزور مسلمانوں کو سہارا ملے گا جن پر قافیہ حیات تنگ ہوا جا رہا ہے۔ اور پھر واقعتاً ایسا ہوا بھی کہ حضرت عمر اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما کے ایمان لانے کے بعد مکہ میں کمزور مسلمانوں پر قریش کے ظلم وتعدی میں کافی حد تک کمی آ گئی۔

بہرحال اس سلسلے میں معروضی حقائق کسی بھی داعی کو اس طرف راغب کرتے ہیں کہ



معاشرے کے متمول طبقوں اور اربابِ اختیار واقتدار تک پیغام حق ترجیحی بنیادوں پر پہنچایا جائے اور انہیں اپنی تحریک میں شامل کرنے کے لیے تمام ممکنہ وسائل بروئے کار لائے جائیں۔ مگر دوسری طرف اس حکمت عملی سے تحریک کے نادار اور عام ارکان کو یہ تاثر ملنے کا اندیشہ ہوتا ہے کہ انہیں کم حیثیت سمجھ کر نظر انداز کیا جا رہا ہے اور اس طرح اُن کی حوصلہ شکنی ہونے کا امکان پیدا ہوتا ہے۔ اس معاملے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جب کوئی داعیٔ حق اثر ورسوخ کے حامل افراد کی طرف ترجیحی انداز میں متوجہ ہوگا تو عوام میں اُس کی ذات اور اُس کی تحریک کے بارے میں یہ تاثر ابھرنے کا اندیشہ ہوگا کہ یہ لوگ بھی امراء اور اربابِ اختیار سے مرعوب ہیں اور ان کے ہاں بھی دُنیوی ٹھاٹھ باٹھ ہی کو ترجیح دی جاتی ہے۔ چنانچہ دولت مند اور اثر ورسوخ کے حامل افراد تک دین کی دعوت کو پھیلانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ اس سلسلے میں مذکورہ بالا دو عوامل کے منفی اثرات سے بچنا بھی نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ حضورﷺ کو اس آیت میں حکم دیا جا رہا ہے کہ آپؐ اس سلسلے میں احتیاط کریں‘ کہیں لوگ یہ تاثر نہ لے لیں کہ محمد (ﷺ) کے ہاں بھی دولت مند لوگوں ہی کو خصوصی اہمیت دی جاتی ہے۔

﴿وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿٢٨﴾﴾
’’اور مت کہنا مانیے ایسے شخص کا جس کا دل ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جو اپنی خواہشات کے پیچھے پڑا ہے اور اس کا معاملہ حد سے متجاوز ہو چکا ہے۔‘‘

یہ بات متعدد بار بیان ہو چکی ہے کہ کفارِ مکہ رسول اللہﷺ کے ساتھ مداہنت پر مصر تھے اور وہ آپؐ کے ساتھ کچھ دو اور کچھ لو کی بنیاد پر مذاکرات کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں سردارانِ قریش کی طرف سے آپؐ پر شدید دباؤ تھا۔ اس پس منظر میں یہاں پھر متنبہ کیا جا رہا ہے کہ جن لوگوں کے دلوں کو ہم نے اپنی یاد سے غافل اور محروم کر دیا ہے آپؐ ایسے لوگوں کی باتوں کی طرف دھیان بھی مت دیجیے!

**آیت ۲۹** ﴿وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۣ فَمَنْ شَاۗءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاۗءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ﴾ ’’اور آپؐ کہہ دیجیے کہ یہی حق ہے تمہارے رب کی طرف سے‘ تو اب جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔‘‘

کفارِ مکہ کی طرف سے کوئی درمیانی راستہ نکالنے کی کوششوں کے جواب میں یہاں

حضورﷺ کی زبانِ مبارک سے واضح اور دوٹوک انداز میں اعلان کرایا جا رہا ہے کہ تمہارے رب کی طرف سے جو حق میرے پاس آیا ہے وہ میں نے تم لوگوں کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اب تمہارے سامنے دو ہی راستے ہیں' اسے من وعن قبول کر لو یا اسے رد کر دو۔ لیکن یاد رکھو اس میں کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر تم سے کوئی سودے بازی ممکن نہیں۔ یہ وہی مضمون ہے جو سورة الدھر میں اس طرح بیان ہوا ہے: ﴿اِنَّا ھَدَیۡنٰہُ السَّبِیۡلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّ اِمَّا کَفُوۡرًا ﴿۳﴾﴾ یعنی ہم نے انسان کے لیے ہدایت کا راستہ واضح کر دیا ہے اور اس کو اختیار دے دیا ہے کہ اب چاہے وہ شکر گزار بنے اور چاہے ناشکرا۔

﴿اِنَّاۤ اَعۡتَدۡنَا لِلظّٰلِمِیۡنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِھِمۡ سُرَادِقُھَا ؕ﴾ ''ہم نے ظالموں کے لیے آگ تیار کر رکھی ہے' اُس کی قناتیں ان کا احاطہ کر لیں گی''۔
جہنم کی آگ قناتوں کی شکل میں ہوگی اور وہ اللہ کے منکرین اور مشرکین کو گھیرے میں لے لے گی۔

﴿وَ اِنۡ یَّسۡتَغِیۡثُوۡا یُغَاثُوۡا بِمَآءٍ کَالۡمُھۡلِ یَشۡوِی الۡوُجُوۡہَ ؕ﴾ ''اور اگر وہ پانی کے لیے فریاد کریں گے تو ان کی فریاد رسی ایسے پانی سے کی جائے گی جو (کھولتے ہوئے) تیل کی تلچھٹ جیسا ہوگا' جو چہروں کو بھون ڈالے گا''۔

﴿بِئۡسَ الشَّرَابُ ؕ وَ سَآءَتۡ مُرۡتَفَقًا ﴿۲۹﴾﴾ ''بہت ہی بری چیز ہوگی پینے کی' اور وہ (جہنم) بہت ہی بری جگہ ہے آرام کی!''

''مُھۡل'' کا ترجمہ تیل کی تلچھٹ کے علاوہ لاوا بھی کیا گیا ہے اور پگھلا ہوا تانبا بھی۔ سورۂ ابراہیم کی آیت ۱۶ میں جہنمیوں کو پلائے جانے والے پانی کو ''مَآءٍ صَدِیۡدٍ'' کہا گیا ہے جس کے معنی زخموں سے رسنے والی پیپ کے ہیں۔ بہرحال یہ سیال مادہ جو انہیں پانی کے طور پر دیا جائے گا اس قدر گرم ہوگا کہ ان کے چہروں کو بھون کر رکھ دے گا۔ اب آئندہ آیات میں فوری تقابل کے لیے اہل جنت کا ذکر آ رہا ہے۔

**آیت ۳۰** ﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِیۡعُ اَجۡرَ مَنۡ اَحۡسَنَ عَمَلًا ﴿۳۰﴾﴾ ''یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے عمل کیے تو ہم نہیں ضائع کریں گے اجر اُس شخص کا جس نے اچھا عمل کیا''۔



**آیت ۳۱** ﴿اُولٰٓئِکَ لَھُمۡ جَنّٰتُ عَدۡنٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِھِمُ الۡاَنۡھٰرُ﴾ ''ان ہی لوگوں کے لیے ہیں رہنے کے ایسے باغات جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی''

﴿یُحَلَّوۡنَ فِیۡھَا مِنۡ اَسَاوِرَ مِنۡ ذَھَبٍ وَّ یَلۡبَسُوۡنَ ثِیَابًا خُضۡرًا مِّنۡ سُنۡدُسٍ وَّ اِسۡتَبۡرَقٍ﴾ ''انہیں پہنائے جائیں گے اس میں سونے کے کنگن اور وہ پہنیں گے سبز رنگ کے کپڑے باریک ریشم کے اور موٹے ریشم کے''

یعنی ان کا اوپر کا لباس باریک ریشم کا ہوگا جبکہ نیچے کا لباس موٹے ریشم کا ہوگا۔

﴿مُّتَّکِئِیۡنَ فِیۡھَا عَلَی الۡاَرَآئِکِ ؕ﴾ ''ٹیک لگائے بیٹھے ہوں گے تختوں پر''۔

﴿نِعۡمَ الثَّوَابُ ؕ وَ حَسُنَتۡ مُرۡتَفَقًا ﴿۳۱﴾﴾ ''کیا ہی اچھا بدلہ ہوگا (ان کے لیے) اور کیا ہی خوب آرام گاہ ہوگی!''

## آیات ۳۲ تا ۴۴

وَ اضۡرِبۡ لَھُمۡ مَّثَلًا رَّجُلَیۡنِ جَعَلۡنَا لِاَحَدِھِمَا جَنَّتَیۡنِ مِنۡ اَعۡنَابٍ
وَّ حَفَفۡنٰھُمَا بِنَخۡلٍ وَّ جَعَلۡنَا بَیۡنَھُمَا زَرۡعًا ﴿ؕ۳۲﴾ کِلۡتَا الۡجَنَّتَیۡنِ اٰتَتۡ اُکُلَھَا وَ لَمۡ
تَظۡلِمۡ مِّنۡہُ شَیۡئًا ۙ وَّ فَجَّرۡنَا خِلٰلَھُمَا نَھَرًا ﴿ۙ۳۳﴾ وَّ کَانَ لَہٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِہٖ
وَ ھُوَ یُحَاوِرُہٗۤ اَنَا اَکۡثَرُ مِنۡکَ مَالًا وَّ اَعَزُّ نَفَرًا ﴿۳۴﴾ وَ دَخَلَ جَنَّتَہٗ وَ ھُوَ ظَالِمٌ
لِّنَفۡسِہٖ ۚ قَالَ مَاۤ اَظُنُّ اَنۡ تَبِیۡدَ ھٰذِہٖۤ اَبَدًا ﴿ۙ۳۵﴾ وَّ مَاۤ اَظُنُّ السَّاعَۃَ قَآئِمَۃً ۙ
وَّ لَئِنۡ رُّدِدۡتُّ اِلٰی رَبِّیۡ لَاَجِدَنَّ خَیۡرًا مِّنۡھَا مُنۡقَلَبًا ﴿۳۶﴾ قَالَ لَہٗ صَاحِبُہٗ
وَ ھُوَ یُحَاوِرُہٗۤ اَکَفَرۡتَ بِالَّذِیۡ خَلَقَکَ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ مِنۡ نُّطۡفَۃٍ ثُمَّ سَوّٰىکَ
رَجُلًا ﴿ؕ۳۷﴾ لٰکِنَّا۠ ھُوَ اللّٰہُ رَبِّیۡ وَ لَاۤ اُشۡرِکُ بِرَبِّیۡۤ اَحَدًا ﴿۳۸﴾ وَ لَوۡ لَاۤ اِذۡ دَخَلۡتَ
جَنَّتَکَ قُلۡتَ مَا شَآءَ اللّٰہُ ۙ لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ ۚ اِنۡ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنۡکَ مَالًا
وَّ وَلَدًا ﴿ۚ۳۹﴾ فَعَسٰی رَبِّیۡۤ اَنۡ یُّؤۡتِیَنِ خَیۡرًا مِّنۡ جَنَّتِکَ وَ یُرۡسِلَ عَلَیۡھَا حُسۡبَانًا
مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصۡبِحَ صَعِیۡدًا زَلَقًا ﴿ۙ۴۰﴾ اَوۡ یُصۡبِحَ مَآؤُھَا غَوۡرًا فَلَنۡ تَسۡتَطِیۡعَ
لَہٗ طَلَبًا ﴿۴۱﴾ وَ اُحِیۡطَ بِثَمَرِہٖ فَاَصۡبَحَ یُقَلِّبُ کَفَّیۡہِ عَلٰی مَاۤ اَنۡفَقَ فِیۡھَا وَ ھِیَ

خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ۝ وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ۝ هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ۭ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا ۝

اس رکوع میں دو اشخاص کے باہمی مکالمے کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ ان میں سے ایک شخص کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت اور بہت سی دوسری دُنیوی نعمتوں سے نواز رکھا تھا۔ وہ شخص اپنی خوشحالی میں اس قدر مگن ہوا کہ اس کی نگاہ اللہ سے ہٹ کر مادی وسائل پر ہی جم کر رہ گئی اور انہی اسباب و وسائل کو وہ اپنے توکل اور بھروسے کا مرکز بنا بیٹھا۔ اس کے ساتھ ایک دوسرا شخص تھا جو دُنیوی لحاظ سے خوشحال تو نہیں تھا مگر اُسے اللہ کی معرفت حاصل تھی۔ اُس نے اُس دولت مند شخص کو نصیحت کی کہ اللہ نے تمہیں بہت سی نعمتوں سے نوازا ہے مگر تم اُسے بالکل ہی بھولے ہوئے ہو۔ تمہیں چاہیے کہ تم اللہ کا شکر ادا کرو۔ دولت مند شخص نے گھمنڈ میں آ کر اس کی نصیحت کا بہت تلخ جواب دیا اور کہا کہ مجھے تو یہ ساری نعمتیں اس لیے ملی ہیں کہ میں اللہ کا چہیتا ہوں جبکہ میرے مقابلے میں تمہاری کوئی حیثیت نہیں۔ اللہ کے اس بندے نے اسے پھر سمجھایا کہ دیکھو اپنے دُنیوی مال و اسباب پر مت اتراؤ' کیونکہ اللہ اگر چاہے تو تمہارے یہ سارے ٹھاٹھ باٹھ پل بھر میں ختم کر کے رکھ دے۔ وہ چاہے تو تمہاری ساری دولت اور مال و اسباب کو ضائع کر سکتا ہے۔ اس نے جواباً کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے اپنے مال و اسباب کی حفاظت کا خوب بندوبست کر رکھا ہے۔ الغرض ان تمام نصیحتوں کا اُس شخص پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ دُنیوی اَسباب کے نشے نے اس کو اس قدر اندھا کر رکھا تھا کہ اسے حقیقی مسبب الاسباب کی قدرت کا کچھ اندازہ ہی نہ رہا۔ بالآخر اُس کے اس رویے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا سب کچھ برباد کر کے رکھ دیا اور وہ اپنے رویے پر کف افسوس ملتا رہ گیا۔ اپنی بربادی کے بعد جب اس شخص کی آنکھیں کھلیں تو تب بہت دیر ہو چکی تھی۔

یہاں اس دولت مند شخص کا وہ فقرہ خاص طور پر قابل غور ہے جو اپنی بربادی کے بعد پچھتاتے ہوئے اس کی زبان سے نکلا تھا کہ ''کاش میں نے اپنے رب کے ساتھ شرک نہ کیا ہوتا!'' دیکھا جائے تو اس سارے واقعے میں کسی ظاہری شرک کا ارتکاب نظر نہیں آتا۔ کسی دیوی یا دیوتا کی پوجا پاٹ کا بھی کوئی حوالہ یہاں نہیں آیا' اللہ کے سوا کسی دوسرے معبود کا بھی ذکر نہیں ہوا' تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا اقدام تھا جس پر وہ شخص پچھتایا کہ کاش میں



نے اپنے رب سے شرک نہ کیا ہوتا! اس پہلو سے اگر اس سارے واقعے کا باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو یہ نکتہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہاں جس شرک کا ذکر ہوا ہے وہ ''مادہ پرستی'' کا شرک ہے۔ اس شخص نے اپنے مادی اسباب و وسائل کو ہی اپنا سب کچھ سمجھ لیا تھا۔ جو بھروسا اور توکّل اُسے حقیقی مسبب الاسباب پر کرنا چاہیے تھا وہ بھروسا اور توکل اُس نے اپنے مادی وسائل پر کر لیا تھا اور اس طرح ان مادی وسائل کو معبود کا درجہ دے دیا تھا۔ یہی رویہ اور یہی سوچ مادہ پرستی ہے اور یہی موجودہ دور کا سب سے بڑا شرک ہے۔

موجودہ دور ستارہ پرستی اور بت پرستی کا دور نہیں۔ آج کا انسان ستاروں کی اصل حقیقت جان لینے اور چاند پر قدم رکھ لینے کے بعد ان کی پوجا کیونکر کرے گا؟ چنانچہ آج کے دور میں اللہ کو چھوڑ کر انسان نے جو معبود بنائے ہیں ان میں مادہ پرستی اور وطن پرستی سب سے اہم ہیں۔ آج دولت کو معبود کا درجہ دے دیا گیا ہے اور مادی وسائل اور ذرائع کو مسبب الاسباب سمجھ لیا گیا ہے۔ یہ موجودہ دور کا بہت خطرناک شرک ہے اور اس سے محفوظ رہنے کے لیے اسے بہت باریک بینی سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

**آیت ۳۲** ﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ بیان کیجیے ان کے لیے دو اشخاص کی مثال''

﴿جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ﴾ ''اُن میں سے ایک کو ہم نے دیے تھے دو باغ انگوروں کے اور اُن دونوں کا گھیر دیا تھا ہم نے کھجوروں کے درختوں کے ساتھ''

انگوروں کی بیلوں کے گرداگرد کھجوروں کے درختوں کی باڑ تھی تاکہ نازک بیلیں آندھی' طوفان وغیرہ سے محفوظ رہیں۔

﴿وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ۝۳۲﴾ ''اور ہم نے ان دونوں (باغوں) کے درمیان کھیتی کا انتظام بھی کر رکھا تھا۔''

بنیادی طور پر وہ انگوروں کے باغات تھے۔ ان کے اطراف میں کھجوروں کے درخت تھے' جن کی دوہری افادیت تھی۔ ان درختوں سے کھجوریں بھی حاصل ہوتی تھیں اور وہ حفاظتی باڑ کا کام بھی دیتے تھے۔ درمیان میں کچھ زمین کاشت کاری کے لیے بھی تھی' جس سے اناج

وغیرہ حاصل ہوتا تھا۔ گویا ہر لحاظ سے مثالی باغات تھے۔

**آیت ۳۳** ﴿كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا ۙ﴾ ’’دونوں باغات اپنا پھل خوب دیتے اور اس میں سے کچھ بھی کم نہ کرتے تھے‘‘

وہ دونوں باغات ہر سال موسم کے مطابق خوب پھلتے تھے اور ان کی پیداوار میں کبھی کوئی کمی نہیں آتی تھی۔ ان باغوں کا مالک شخص سالہا سال سے ان کی پیداوار سے مسلسل فائدہ اٹھاتے اٹھاتے انہیں دائمی سمجھ بیٹھا اور وہ بالکل ہی بھول گیا کہ یہ سب کچھ اللہ کی مشیت اور اجازت ہی سے ممکن ہے۔

﴿وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ﴿٣٣﴾﴾ ’’اور ہم نے جاری کر دی تھی ان کے درمیان ایک نہر۔‘‘

ان دونوں باغوں کے بیچوں بیچ ایک نہر بہتی تھی۔ گویا ان کی آب پاشی کا نظام بھی مثالی تھا۔

**آیت ۳۴** ﴿وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ﴾ ’’اور اُس کے لیے پھل بھی تھا۔‘‘

اس کا ایک مفہوم تو یہی ہے کہ جب ان دونوں کا آپس میں مکالمہ ہو رہا تھا اُس وقت وہ دونوں باغات پھلوں سے خوب لدے ہوئے تھے‘ جبکہ دوسرا مفہوم جو میرے نزدیک راجح ہے‘ یہ ہے کہ اُس شخص کو اللہ نے اولاد بھی خوب دے رکھی تھی۔ اس لیے کہ انسان کے لیے اس کی اولاد کی وہی حیثیت ہے جو کسی درخت کے لیے اس کے پھل کی ہوتی ہے۔

﴿فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ﴿٣٤﴾﴾ ’’تو کہا اُس نے اپنے ساتھی سے —— اور وہ آپس میں گفتگو کر رہے تھے —— کہ میں تم سے بہت زیادہ ہوں مال میں اور بہت بڑھا ہوا ہوں نفری میں۔‘‘

یہاں جس فخر سے اُس شخص نے اپنی نفری کا ذکر کیا ہے اس کے اس انداز سے تو ﴿وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ﴾ کا یہی ترجمہ بہتر محسوس ہوتا ہے کہ اُس شخص کو اولاد خصوصاً بیٹوں سے بھی نوازا گیا تھا۔

**آیت ۳۵** ﴿وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ﴾ ’’اور وہ داخل ہوا اپنے باغ میں اس حال میں کہ وہ اپنی جان پر ظلم کر رہا تھا۔‘‘

﴿قَالَ مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا ﴿٣٥﴾﴾ ’’اُس نے کہا: میں نہیں سمجھتا کہ یہ (باغ) کبھی بھی برباد ہو سکتا ہے۔‘‘



یعنی میرا یہ باغ ہر لحاظ سے مثالی ہے۔ اسے میں نے باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت ہر قسم کے خطرات سے محفوظ بنا رکھا ہے۔ انگوروں کی نازک بیلوں کے گرداگرد کھجوروں کے بلند و بالا درخت سنتریوں کی طرح کھڑے ہر قسم کے طوفان اور بادِ صرصر کے تھپیڑوں سے اس کی حفاظت کر رہے ہیں۔ آب پاشی کے لیے نہر کا وافر پانی ہر وقت موجود ہے۔ لہٰذا میں نہیں سمجھتا کہ اسے کبھی کسی قسم کا کوئی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔

**آیت ۳۶** ﴿وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ﴾ ’’اور میں یہ گمان نہیں کرتا کہ قیامت قائم ہونے والی ہے‘‘

یہ قیامت وغیرہ کی باتیں سب ڈھکوسلے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ ایسا کوئی واقعہ حقیقت میں رونما ہونے والا ہے۔

﴿وَّلَىِٕنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿٣٦﴾﴾ ’’اور اگر مجھے لوٹا ہی دیا گیا اپنے رب کی طرف تو میں لازماً پاؤں گا اس سے بھی بہتر پلٹنے کی جگہ۔‘‘

قیامت و آخرت کا اول تو میں قائل ہی نہیں‘ لیکن قیامت اگر ہوئی بھی تو میں بہر حال وہاں اس سے بھی بہتر زندگی پاؤں گا۔ ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص اللہ کا منکر نہیں تھا مگر دُنیوی مال و دولت اور مادی اسباب و ذرائع پر بھروسا کر کے شرک کا ارتکاب کر رہا تھا۔ یہ شخص یہاں پر جو فلسفہ بیان کر رہا ہے وہ اکثر مادّہ پرست لوگوں کے ہاں بہت مقبول ہے۔ یعنی اگر مجھے دنیا میں اللہ تعالیٰ نے خوشحالی و فارغ البالی سے نواز رکھا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ مجھ سے خوش ہے۔ اسی لیے اس نے مجھے خصوصی صلاحیتیں عطا کی ہیں جن کی وجہ سے میں نے یہ اسباب و وسائل اکٹھے کیے ہیں۔ چنانچہ وہ آخرت میں بھی ضرور اپنی نعمتوں سے مجھے نوازے گا۔ اور جو لوگ یہاں دنیا میں جوتیاں چٹخاتے پھر رہے ہیں وہ آخرت میں بھی اسی طرح بے یار و مددگار رہوں گے۔

**آیت ۳۷** ﴿قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ﴾ ’’اس کے ساتھی نے اس سے کہا اور وہ اس سے گفتگو کر رہا تھا‘‘

﴿اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ﴿٣٧﴾﴾

’’کیا تُو نے کفر کیا اُس ہستی کا جس نے پیدا کیا تجھے مٹی سے‘ پھر گندے پانی کی بوند سے‘ پھر تجھے صحیح سلامت انسان بنا دیا؟‘‘

یہاں یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ وہ شخص بظاہر اللہ کا منکر نہیں تھا مگر پھر بھی اسے اللہ سے کفر کا مرتکب بتایا گیا ہے۔ وہ اس لیے کہ اس سے پہلے وہ آخرت کا انکار کر چکا تھا اور آخرت کا انکار دراصل اللہ کا انکار ہے۔ گویا جو شخص آخرت کا منکر ہو اس کا ایمان باللہ کا دعویٰ بھی قابلِ قبول نہیں۔

**آیت ۳۸** ﴿لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ۝۳۸﴾ ''لیکن (میں تو مانتا ہوں کہ) وہ اللہ میرا رب ہے اور میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا۔''

**آیت ۳۹** ﴿وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَاۗءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ﴾ ''اور جب تُو اپنے باغ میں داخل ہوا تو تُو نے یوں کیوں نہ کہا: ماشاء اللہ! (یعنی یہ سب اللہ کے فضل و کرم سے ہے۔) اللہ کے بدون کسی کو کوئی طاقت حاصل نہیں۔''

تجھے جب باغ میں ہر طرف خوش کن مناظر دیکھنے کو ملے اور پورا باغ پھلوں سے لدا ہوا نظر آیا تو تیری زبان سے ''ماشاء اللہ'' کیوں نہ نکلا اور تو نے یہ کیوں نہ کہا کہ یہ میرا کمال نہیں بلکہ اللہ کی دین ہے جو اصل طاقت اور اختیار کا مالک ہے' اُس کی اجازت اور مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ ''ماشاء اللہ'' وہ کلمہ ہے جس میں توحید کوٹ کوٹ کر بھری ہے' کہ جو اللہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے' کسی اور کے چاہنے سے یا اسباب و وسائل کے ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔

﴿اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا ۝۳۹﴾ ''اگر تو مجھے دیکھتا ہے کہ میں تم سے مال اور اولاد میں کم ہوں۔''

**آیت ۴۰** ﴿فَعَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ﴾ ''تو امید ہے کہ میرا رب تیرے باغ سے بہتر باغ مجھے دے دے''

مجھے یقین ہے کہ میرا رب اگر چاہے تو تمہارے ان باغوں سے بہتر نعمتوں سے مجھے نواز دے۔

﴿وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَاۗءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا ۝۴۰﴾ ''اور وہ بھیج دے اس (تیرے باغ) پر کوئی آفت آسمان سے تو وہ صاف چٹیل میدان ہو کر رہ جائے۔''

یہ بھی ممکن ہے کہ تمہارے اس کفر و تکبر کے باعث اللہ تعالیٰ تمہارے باغوں پر کوئی ایسی آفت نازل کر دے کہ اس قطعہ زمین پر کسی درخت یا کسی بیل وغیرہ کا نام و نشان تک نہ رہے۔

**آیت ۴۱** ﴿اَوْ يُصْبِحَ مَاۗؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا ۝۴۱﴾ ''یا اس کا پانی گہرائی



میں اتر جائے' پھر تم اس (پانی) کو کسی طرح حاصل نہ کر سکو۔''

اللہ تمہارے باغ پر کوئی آسمانی آفت نہ بھی بھیجے تو یوں بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے حکم سے اس کا زیر زمین پانی غیر معمولی گہرائی میں چلا جائے۔ اس کے نتیجے میں تمہارا بنایا ہوا نظام آب پاشی ختم ہو کر رہ جائے اور اس طرح پانی کے بغیر یہ باغ خود بخود ہی اجڑ جائے۔ یعنی حقیقی مسبّب الاسباب تو اللہ ہی ہے۔ اسی نے مختلف اسباب مہیا کر رکھے ہیں جس سے یہ کاروبارِ دنیا چل رہا ہے۔ وہ جب چاہے کسی سبب کو سلب کر لے یا اس کی ہیئت کو بدل دے اور اس کی وجہ سے یہ سارا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے۔ یہ معاملہ تو گویا شیش محل کی طرح کا ہے کہ ایک ہی پتھر اس کو چکنا چور کر کے رکھ دے گا۔

**آیت ۴۲** ﴿وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ﴾ ''اور اُس کا سارا ثمر سمیٹ لیا گیا''

اس شخص کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو نعمتیں دی گئی تھیں وہ سب اس سے سلب کر لی گئیں۔ باغ بھی اجڑ گیا اور اولاد بھی چھن گئی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوسرا شخص اللہ کا خاص مقرب بندہ تھا۔ مال دار شخص نے اسے اس کی ناداری کا طعنہ دیا تھا: ﴿اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ۝۳۴﴾ کہ مال و دولت میں بھی مجھے تم پر فوقیت حاصل ہے اور نفری میں بھی میں تم سے بڑھ کر ہوں۔ اس طعنے سے اللہ کے اس نیک بندے کا دل دکھا ہوگا' جس کی سزا اسے فوری طور پر ملی اور اللہ نے اس سے سب کچھ چھین لیا۔ اس سلسلے میں ایک حدیث قدسی ہے: ((مَنْ عَادٰى لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ آذَنْتُهُ بِالْحَرْبِ))(۱) ''جو شخص میرے کسی ولی کے ساتھ دشمنی کرے تو میری طرف سے اُس کے خلاف اعلانِ جنگ ہے''۔ کسی شاعر نے اس مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے:

؎ تا دلِ صاحب دلے نالد بدرد ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد!

یعنی کسی صاحب دل ولی اللہ کے دل کو جب ٹھیس لگتی ہے تو اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے پوری قوم گرفت میں آ جاتی ہے۔

﴿فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰي مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا﴾ ''تو وہ ہاتھ ملتا رہ گیا اس پر جو کچھ اس نے اس میں خرچ کیا تھا''

یقیناً ان باغوں کی منصوبہ بندی کرنے' پودے لگانے اور ان کی نشوونما کرنے میں اس نے زرِ کثیر خرچ کیا تھا' مسلسل محنت کی تھی اور اپنا قیمتی وقت اس میں کھپایا تھا۔ اس کا یہ تمام

(۱) صحیح البخاری' کتاب الرقاق' باب التواضع۔

سرمایہ آن کی آن میں نیست و نابود ہو گیا اور وہ اس کی بربادی پر کفِ افسوس ملنے کے علاوہ کچھ نہ کر سکا۔

﴿وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا﴾ ’’اور وہ (باغ) گرا پڑا تھا اپنی چھتریوں پر‘‘

انگوروں کی بیلیں جن چھتریوں پر چڑھائی گئی تھیں وہ سب کی سب اوندھی پڑی تھیں۔

﴿وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ﴿٤٢﴾﴾ ’’اور وہ کہہ رہا تھا: ہائے میری شامت‘ کاش میں نے اپنے ربّ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا ہوتا۔‘‘

اس مال دار شخص کے مکالمے سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اُس شخص نے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے اختیار کو بھلا کر ظاہری اسباب اور مادی وسائل پر توکل کر لیا تھا‘ اور یہی وہ شرک تھا جس کا خود اس نے یہاں اعتراف کیا ہے۔ آج کی مادہ پرستانہ ذہنیت کا مکمل نقشہ اس رکوع میں پیش کر دیا گیا ہے۔ یہ شرک کی جدید قسم ہے جس کو پہچاننے اور جس سے محتاط رہنے کی آج ہمیں اشد ضرورت ہے۔ (اس حوالے سے میری کتاب ’’حقیقت و اقسامِ شرک‘‘ کا مطالعہ مفید رہے گا‘ جس میں شرک اور اس کی اقسام کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔)

**آیت ۴۳** ﴿وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ﴿٤٣﴾﴾ ’’اور نہ ہوئی اُس کے لیے کوئی جماعت جو اللہ کے مقابلے میں اُس کی مدد کو آتی اور نہ وہ خود ہی انتقام لینے والا بن سکا۔‘‘

اللہ کے مقابلے میں بھلا کون اس کی مدد کر سکتا تھا اور اس صورت حال میں وہ کس سے انتقام لے سکتا تھا؟

**آیت ۴۴** ﴿هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ۭ﴾ ’’یہاں تو تمام اختیار اللہ ہی کا ہے جو الحق ہے۔‘‘

ولایت کے معنی یہاں حکومت اور اقتدار کے ہیں۔ ’’والی‘‘ کسی ملک یا علاقے کے مالک یا حکمران کو کہتے ہیں اور اسی سے یہ لفظ وَلایت (واؤ کی زبر کے ساتھ) بنا ہے۔ اس لحاظ سے آیت کے الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ کُل کا کُل اقتدار و اختیار اللہ کے لیے ہے جو ’’الحق‘‘ ہے۔ اسی مادہ سے لفظ ’’ولی‘‘ بھی ہے جس کے معنی دوست اور پشت پناہ کے ہیں۔ اسی مادّے سے وِلایت (واؤ کی زیر کے ساتھ) بنا ہے اور یہ دوستی اور محبت کے معنی دیتا ہے۔ درج ذیل



آیات میں اسی ولایت کا ذکر ہے: ﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ (البقرۃ:۲۵۷) اور ﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٢﴾﴾ (یونس)۔

﴿هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا ﴿٤٤﴾﴾ ’’وہی بہتر ہے انعام دینے میں اور وہی بہتر ہے عاقبت کے اعتبار سے۔‘‘

انعام وہی بہتر ہے جو وہ بخشے اور انجام وہی بخیر ہے جو وہ دکھائے۔

## آیات ۴۵ تا ۴۹

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ﴿٤٥﴾ اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا ﴿٤٦﴾ وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَّحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ﴿٤٧﴾ وَعُرِضُوْا عَلٰي رَبِّكَ صَفًّا ۭ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍۢ ۡ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا ﴿٤٨﴾ وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴿٤٩﴾

**آیت ۴۵** ﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ ’’اور بیان کیجیے ان کے لیے مثال دُنیا کی زندگی کی‘‘

﴿كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ﴾ ’’جیسے پانی کہ ہم نے اسے اتارا آسمان سے‘ پھر اس کے ساتھ مل جل کر نکل آیا زمین کا سبزہ‘‘

﴿فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ۭ﴾ ’’پھر وہ ہو گیا چورا چورا‘ اڑائے پھرتی ہیں اسے ہوائیں۔‘‘

﴿وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ﴿٤٥﴾﴾ ’’اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔‘‘

سبزے کے اُگنے‘ اس کے نشوونما پانے اور پھر خشک ہو کر خس و خاشاک کی شکل اختیار کر لینے کے عمل کو انسانی زندگی کی مشابہت کی بنا پر یہاں بیان کیا گیا ہے۔ بارش کے برستے ہی زمین سے طرح طرح کے نباتات نکل آتے ہیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے زمین سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے۔ جب یہ سبزہ اپنے جوبن پر ہوتا ہے تو بڑا خوش کن منظر پیش کرتا ہے۔ مگر پھر جلد ہی اس پر زردی چھانے لگتی ہے اور چند ہی دنوں میں لہلہاتا ہوا سبزہ خس و خاشاک کا ڈھیر بن جاتا ہے اور زمین پھر سے چٹیل میدان کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ سبزے یا کسی فصل کے اُگنے‘ بڑھنے اور خشک ہونے کا یہ دورانیہ چند ہفتوں پر محیط ہو یا چند مہینوں پر‘ اس کی اصل حقیقت اور کیفیت بس یہی ہے۔

اس مثال کو مدنظر رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو بالکل یہی کیفیت انسانی زندگی کی بھی ہے۔ جس طرح نباتاتی زندگی کا آغاز آسمان سے بارش کے برسنے سے ہوتا ہے اسی طرح روح کے نزول سے انسانی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ انسانی روح کا تعلق عالم امر سے ہے: ﴿قُلِ الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ﴾ (بنی اسرائیل: ۸۵)۔ شکم مادر میں جسد خاکی کے اندر روح پھونکی گئی‘ بچہ پیدا ہوا‘ خوشیاں منائی گئیں‘ جوان اور طاقت ور ہوا‘ تمام صلاحیتوں کو عروج ملا‘ پھر ادھیڑ عمر کو پہنچا‘ جسم اور اس کی صلاحیتیں روز بروز زوال پذیر ہونے لگیں‘ بالوں میں سفیدی آگئی‘ چہرے پر جھریاں پڑ گئیں‘ موت وارد ہوئی‘ قبر میں اتارا گیا اور مٹی میں مل کر مٹی ہو گیا۔ اس cycle کا دورانیہ مختلف افراد کے ساتھ مختلف سہی مگر انسانی زندگی کے آغاز و انجام کی حقیقت بس یہی کچھ ہے۔ چنانچہ انسان کو یہ بات کسی وقت نہیں بھولنی چاہیے کہ دنیا کا عرصۂ حیات ایک وقفۂ امتحان ہے جسے ہر انسان اپنے اپنے انداز میں گزار رہا ہے۔

**آیت ۴۶** ﴿اَلۡمَالُ وَ الۡبَنُوۡنَ زِیۡنَۃُ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا﴾ ”مال اور بیٹے دُنیوی زندگی کی زینت ہیں۔“

اس سورت میں دُنیوی زندگی کی زیب و زینت کا ذکر یہاں تیسری مرتبہ آیا ہے۔ اس سے پہلے ہم آیت ۷ میں پڑھ آئے ہیں کہ روئے زمین کی آرائش و زیبائش اور تمام رونقیں انسانوں کے امتحان کے لیے بنائی گئی ہیں: ﴿اِنَّا جَعَلۡنَا مَا عَلَی الۡاَرۡضِ زِیۡنَۃً لَّہَا لِنَبۡلُوَہُمۡ اَیُّہُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ﴿۷﴾﴾۔ پھر آیت ۲۸ میں رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا: ﴿تُرِیۡدُ زِیۡنَۃَ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚ﴾ کہ اے نبی (ﷺ) کہیں ان لوگوں کو یہ گمان نہ ہو کہ آپ کا مطلوب و



مقصود بھی دُنیوی زندگی کی آرائش و زیبائش ہی ہے (معاذ اللہ!)۔ گویا یہ موضوع اس سورت کے مضامین کا عمود ہے۔ لہٰذا یہ حقیقت ہر وقت ہمارے ذہن میں مستحضر رہنی چاہیے کہ یہ زندگی اور دُنیوی مال و متاع سب عارضی ہیں۔ یہاں کے رشتے ناطے اور تمام تعلقات بھی اسی چار روزہ زندگی تک محدود ہیں۔ انسان کی آنکھ بند ہوتے ہی تمام رشتے اور تعلقات منقطع ہو جائیں گے اور اللہ کی عدالت میں ہر انسان کو تن تنہا پیش ہونا ہوگا: ﴿وَ کُلُّہُمۡ اٰتِیۡہِ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ فَرۡدًا ﴿۹۵﴾﴾ (مریم) وہاں نہ باپ اولاد کی مدد کرے گا‘ نہ بیٹا والدین کو سہارا دے گا‘ اور نہ بیوی شوہر کا ساتھ دے گی۔ اس دن کے محاسبے کا سامنا ہر شخص کو اکیلے ہی کرنا ہوگا۔

﴿وَ الۡبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَیۡرٌ عِنۡدَ رَبِّکَ ثَوَابًا وَّ خَیۡرٌ اَمَلًا ﴿۴۶﴾﴾ ”اور باقی رہنے والی نیکیاں بہت بہتر ہیں تیرے رب کے نزدیک‘ ثواب کے لحاظ سے بھی اور امید کے اعتبار سے بھی۔“

اس مختصر زندگی کی کمائی میں اگر کسی چیز کو بقا حاصل ہے تو وہ نیک اعمال ہیں۔ آخرت میں صرف وہی کام آئیں گے۔ چنانچہ دُنیوی مال و اسباب سے امیدیں نہ لگاؤ‘ اولاد سے توقعات مت وابستہ کرو۔ یہ سب عارضی چیزیں ہیں جو تمہاری موت کے ساتھ ہی تمہارے لیے بے وقعت ہو جائیں گی۔ آخرت کا سہارا چاہیے تو نیک اعمال کا توشہ جمع کرو اور اسی پونجی سے اپنی امیدیں وابستہ کرو۔

**آیت ۴۷** ﴿وَ یَوۡمَ نُسَیِّرُ الۡجِبَالَ وَ تَرَی الۡاَرۡضَ بَارِزَۃً ۙ﴾ ”اور جس دن ہم چلائیں گے پہاڑوں کو اور تم دیکھو گے زمین کو صاف چٹیل“

اب قیامت کا نقشہ کھینچا جا رہا ہے کہ اُس دن پہاڑ اپنی جگہ چھوڑ دیں گے‘ زمین کے تمام نشیب و فراز ختم ہو جائیں گے اور پورا کرۂ ارض ایک صاف چٹیل میدان کی شکل اختیار کر لے گا۔

﴿وَّ حَشَرۡنٰہُمۡ فَلَمۡ نُغَادِرۡ مِنۡہُمۡ اَحَدًا ﴿۴۷﴾﴾ ”اور ہم سب کو جمع کر لیں گے اور ان میں سے کسی ایک کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔“

حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آخری انسان تک پیدا ہونے والے نوع انسانی کے تمام افراد کو اُس دن اکٹھا کر لیا جائے گا۔

**آیت ۴۸** ﴿وَ عُرِضُوۡا عَلٰی رَبِّکَ صَفًّا ؕ لَقَدۡ جِئۡتُمُوۡنَا کَمَا خَلَقۡنٰکُمۡ اَوَّلَ مَرَّۃٍ ۫﴾

''اور وہ پیش کیے جائیں گے آپ کے رب کے سامنے صفیں باندھے ہوئے۔ (تب انہیں کہا جائے گا) آ گئے ہو نا ہمارے پاس‘ جیسے ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا!''

یہاں ''پہلی مرتبہ‘ پیدا کرنے سے مراد عالم ارواح میں انسانی ارواح کی تخلیق ہے‘ جبکہ اس زمین پر جسم اور روح کے ملاپ سے کی جانے والی انسانی تخلیق دراصل تخلیق ثانی ہے۔ فرض کریں اس دنیا کی عمر پندرہ ہزار برس ہے‘ تو ان پندرہ ہزار برسوں میں وہ تمام انسان اس دنیا میں آ چکے ہیں جن کی ارواح اللہ تعالیٰ نے پیدا کی تھیں۔ ان تمام انسانوں کو قیامت کے دن پھر سے اکٹھا کر لیا جائے گا۔ چنانچہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تمام انسان جیسے عالم ارواح میں بیک وقت ایک جگہ اکٹھے تھے‘ اسی طرح قیامت کے دن بھی میدانِ حشر میں سب کے سب بیک وقت موجود ہوں گے۔

﴿بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا ۝۴۸﴾ ''بلکہ تم نے تو سمجھ رکھا تھا کہ ہم تمہارے لیے وعدے کا کوئی وقت مقرر ہی نہیں کریں گے۔''

یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو قرآن کے الفاظ میں ﴿اَلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا﴾ (وہ لوگ جنہیں ہماری ملاقات کی امید نہیں) کے زمرے میں آتے ہیں۔ ایسے لوگ جب اللہ کے حضور پیش ہوں گے تو انہیں ان کا وعدۂ الست ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ﴾ (الاعراف:۱۷۲) بھی یاد دلایا جائے گا‘ کہ تم لوگوں نے مجھے اپنا رب تسلیم کیا تھا‘ پھر تم دنیا کی زندگی میں اس حقیقت کو بالکل ہی بھول گئے کہ تم نے واپس ہمارے پاس بھی آنا ہے۔ تمہیں گمان تک نہیں تھا کہ ہم تمہارے لیے اپنے سامنے پیشی کا کوئی وقت مقرر کریں گے۔

**آیت ۴۹** ﴿وَوُضِعَ الْكِتٰبُ﴾ ''اور رکھ دیا جائے گا اعمال نامہ''

یہ پوری نوعِ انسانی کے ایک ایک فرد کی زندگی کے ایک ایک لمحے اور ایک ایک عمل کی تفصیل پر مشتمل ریکارڈ ہو گا۔ گویا یہ ایک بہت بڑا کمپیوٹر سسٹم ہے جو کسی جگہ پر نصب کیا گیا ہے اور وہاں سے لا کر میدان حشر میں رکھ دیا جائے گا۔ آج سے سو برس پہلے تو ایسی تفصیلات کو تسلیم کرنے کے لیے صرف ایمان بالغیب کا ہی سہارا لینا پڑتا تھا مگر آج کے دور میں اس سب کچھ پر یقین کرنا بہت آسان ہو گیا ہے۔ آج ہم انسان کے بنائے ہوئے کمپیوٹر کے کمالات اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور اپنے معمولاتِ زندگی میں ان سے استفادہ کر رہے ہیں۔ آج جب ہم ایک بٹن جتنی جسامت کی chip میں مفصل معلومات پر مشتمل ریکارڈ اپنی آنکھوں سے



دیکھتے ہیں تو ہمیں اللہ تعالیٰ کی وضع کردہ ڈیٹا بیس (الکتاب) کے بارے میں کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ اس میں کس طرح ایک ایک فرد کی ایک ایک حرکت کی ریکارڈنگ محفوظ ہو گی اور پلک جھپکنے کی دیر بھی نہیں لگے گی کہ اس کا پرنٹ متعلقہ فرد کے ہاتھ میں تھما دیا جائے گا۔

﴿فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ﴾ ''چنانچہ تم دیکھو گے مجرموں کو کہ ڈر رہے ہوں گے اس سے جو کچھ اس میں ہو گا''

مجرم لوگ اپنی کتابِ زندگی کے اندراجات سے لرزاں و ترساں ہوں گے۔

﴿وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ﴾ ''اور کہیں گے: ہائے ہماری شامت! یہ کیسا اعمال نامہ ہے؟ اس نے تو نہ کسی چھوٹی چیز کو چھوڑا ہے اور نہ کسی بڑی کو‘ مگر اس کو محفوظ کر رکھا ہے۔''

﴿وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ۝۴۹﴾ ''اور وہ پائیں گے جو عمل بھی انہوں نے کیا ہو گا اُسے موجود۔ اور آپ کا رب ظلم نہیں کرے گا کسی پر بھی۔''


## ہماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

- ☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
- ☆ بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
- ☆ بانیٔ تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
- ☆ تلاوتِ قرآن‘ دروسِ قرآن‘ دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
- ☆ صحیح بخاری‘ صحیح مسلم‘ موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم
- ☆ میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
- ☆ اردو اور انگریزی کتابیں
- ☆ آڈیو ویڈیو کیسٹس‘ سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

# یَوْمُ التَّغابُن

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿یَوْمَ یَجْمَعُکُمْ لِیَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِکَ یَوْمُ التَّغَابُنِ ط﴾ (التغابن:۹)

’’جب اجتماع کے دن وہ تم سب کو اکٹھا کرے گا‘ وہ دن ہوگا ایک دوسرے کے مقابلے میں لوگوں کی ہار جیت کا۔‘‘

لفظ تغابن کے معنی میں اتنی وسعت ہے کہ اردو زبان تو کیا‘ کسی دوسرے زبان کے بھی ایک لفظ‘ بلکہ ایک فقرے میں اس کا مفہوم ادا نہیں کیا جا سکتا۔ خود قرآنِ مجید میں بھی قیامت کے جتنے نام آئے ہیں‘ ان میں غالباً سب سے زیادہ پُرمعنی نام یہی ہے۔ اس لیے اس کا مفہوم سمجھنے کے لیے تھوڑی سی تشریح ناگزیر ہے۔

تغابن غبن سے ہے جس کا تلفظ غَبْن بھی ہے اور غَبَن بھی۔ غَبْن زیادہ تر خرید وفروخت اور لین دین کے معاملہ میں بولا جاتا ہے اور غبن رائے کے معاملہ میں۔ لیکن کبھی کبھی اِس کے برعکس بھی استعمال ہوتا ہے۔ لغت میں اِس کے متعدد معنی بیان کیے گئے ہیں: غفلت‘ بھول‘ اپنے حصے سے محروم رہ جانا‘ ایک شخص کا کسی غیر محسوس طریقے سے کاروبار یا باہمی معاملہ میں دوسرے کو نقصان دینا۔ اِس سے جب لفظ تغابن بنایا جائے تو اس میں دو یا زائد آدمیوں کے درمیان غبن واقع ہونے کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ تَغَابَنَ الْقَوْمُ کے معنی ہیں بعض لوگوں کا بعض لوگوں کے ساتھ غبن کا معاملہ کرنا۔ یا ایک شخص کا دوسرے کو نقصان پہنچانا اور دوسرے کا اس کے ہاتھوں نقصان اٹھانا۔ یا ایک کا حصہ دوسرے کو مل جانا اور اس کا اپنے حصے سے محروم رہ جانا۔ یا تجارت میں ایک فریق کا خسارہ اٹھانا اور دوسرے فریق کا نفع اٹھا لے جانا۔ یا کچھ لوگوں کا کچھ دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں غافل یا ضعیف الرائے ثابت ہونا۔

اب اس بات پر غور کیجیے کہ سورۂ تغابن آیت ۸ میں قیامت کے متعلق فرمایا گیا ہے ذٰلِکَ یَوْمُ التَّغَابُنِ ’’وہ دن ہوگا تغابن کا‘‘۔ اِن الفاظ سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ دنیا میں تو شب



وروز تغابن ہوتا ہی رہتا ہے‘ لیکن یہ تغابن ظاہری اور نظر فریب ہے‘ اصل اور حقیقی تغابن نہیں ہے۔ اصل تغابن قیامت کے روز ہوگا۔ وہاں جا کر پتہ چلے گا کہ اصل میں خسارہ کس نے اٹھایا اور کون نفع کما لے گیا۔ اصل میں کس کا حصہ کسے مل گیا اور کون اپنے حصے سے محروم رہ گیا۔ اصل میں دھوکا کس نے کھایا اور کون ہوشیار نکلا۔ اصل میں کس نے اپنا تمام سرمایۂ حیات ایک غلط کاروبار میں کھپا کر اپنا دیوالہ نکال دیا‘ اور کس نے اپنی قوتوں اور قابلیتوں اور مساعی اور اموال اور اوقات کو نفع کے سودے پر لگا کر وہ سارے فائدے لوٹ لیے جو پہلے شخص کو بھی حاصل ہو سکتے تھے اگر وہ دنیا کی حقیقت سمجھنے میں دھوکا نہ کھاتا۔

مفسرین نے یوم التغابن کی تفسیر کرتے ہوئے اس کے متعدد مطلب بیان کیے ہیں جو سب کے سب صحیح ہیں اور اس کے معنی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ بعض مفسرین نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اس روز اہلِ جنت اہلِ دوزخ کا وہ حصہ مار لے جائیں گے جو اُن کو جنت میں ملتا اگر وہ جنتیوں کے سے کام کر کے آتے ہوتے‘ اور اہلِ دوزخ جنتیوں کا وہ حصہ لوٹ لیں گے جو انہیں دوزخ میں ملتا اگر انہوں نے دنیا میں دوزخیوں کے سے کام کیے ہوتے۔ اس مضمون کی تائید بخاری کی وہ حدیث کرتی ہے جو انہوں نے کتاب الرقاق میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

’’جو شخص بھی جنت میں جائے گا اُسے وہ مقام دکھایا جائے گا جو اسے دوزخ میں ملتا اگر وہ بُرا عمل کرتا‘ تاکہ وہ اور زیادہ شکرگزار ہو۔ اور جو شخص بھی دوزخ میں جائے گا اسے وہ مقام دکھا دیا جائے گا جو اسے جنت میں ملتا اگر اس نے نیک عمل کیا ہوتا‘ تاکہ اسے اور زیادہ حسرت ہو۔‘‘

بعض اور مفسرین کہتے ہیں کہ اُس روز ظالم کی اتنی نیکیاں مظلوم لوٹ لے جائے گا جو اُس کے ظلم کا بدلہ ہو سکیں‘ یا مظلوم کے اتنے گناہ ظالم پر ڈال دیے جائیں گے جو اُس کے حق کے برابر وزن رکھتے ہوں۔ اس لیے کہ قیامت کے روز آدمی کے پاس کوئی مال وزر تو ہوگا نہیں کہ وہ مظلوم کا حق ادا کرنے کے لیے کوئی ہرجانہ یا تاوان دے سکے۔ وہاں تو بس آدمی کے اعمال ہی ایک زرِ مبادلہ ہوں گے۔ لہٰذا جس شخص نے دنیا میں کسی پر ظلم کیا ہو وہ مظلوم کا حق اِسی طرح ادا کر سکے گا کہ اپنے پلے میں جو کچھ بھی نیکیاں رکھتا ہو اُن میں سے اُس کا تاوان ادا کرے‘ یا مظلوم کے گناہوں میں سے کچھ اپنے اوپر لے کر اِس کا جرمانہ بھگتے۔ یہ مضمون بھی متعدد احادیث میں رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے۔ بخاری‘ کتاب الرقاق میں حضرت

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

’’جس شخص کے ذمہ اپنے کسی بھائی پر کسی قسم کے ظلم کا بار ہو اُسے چاہیے کہ یہیں اُس سے سبکدوش ہو لے‘ کیونکہ آخرت میں دینار و درہم تو ہوں گے ہی نہیں۔ وہاں اُس کی نیکیوں میں سے کچھ لے کر مظلوم کو دلوائی جائیں گی‘ یا اگر اُس کے پاس نیکیاں کافی نہ ہوں تو مظلوم کے کچھ گناہ اس پر ڈال دیے جائیں گے۔‘‘

اِسی طرح مسند احمد میں حضرت جابر بن عبداللہ بن اُنیسؓ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

’’کوئی جنتی جنت میں اور کوئی دوزخی دوزخ میں اُس وقت تک نہ جا سکے گا جب تک کہ اُس ظلم کا بدلہ نہ چکا دیا جائے جو اُس نے کسی پر کیا ہو‘ حتیٰ کہ ایک تھپڑ کا بدلہ بھی دینا ہوگا‘‘۔ ہم نے عرض کیا کہ یہ بدلہ کیسے دیا جائے گا جبکہ قیامت میں ہم ننگے بُچے ہوں گے؟ فرمایا ’’اپنے اعمال کی نیکیوں اور بدیوں سے بدلہ چکانا ہوگا۔‘‘

مسلم شریف اور مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ایک مرتبہ اپنی مجلس میں لوگوں سے پوچھا: ’’جانتے ہو مفلس کون ہوتا ہے؟‘‘ لوگوں نے عرض کیا ہم میں سے مفلس وہ ہوتا ہے جس کے پاس مال و متاع کچھ نہ ہو۔ فرمایا:

’’میری امت میں مفلس وہ ہے جو قیامت کے روز نماز اور روزہ اور زکوٰۃ ادا کر کے حاضر ہوا ہو‘ مگر اس حال میں آیا ہو کہ کسی کو اس نے گالی دی تھی اور کسی پر بہتان لگایا تھا اور کسی کا مال مار کھایا تھا اور کسی کا خون بہایا تھا اور کسی کو مارا پیٹا تھا۔ پھر اُن سب مظلوموں میں سے ہر ایک پر اُس کی نیکیاں لے لے کر بانٹ دی گئیں۔ اور جب نیکیوں میں سے کچھ نہ بچا جس سے ان کا بدلہ چکایا جا سکے تو اُن میں سے ہر ایک کے کچھ کچھ گناہ لے کر اس پر ڈال دیے گئے‘ اور وہ شخص دوزخ میں پھینک دیا گیا۔‘‘

ایک اور حدیث میں‘ جسے مسلم اور ابوداؤد نے حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے‘ حضور ﷺ نے فرمایا:

’’کسی مجاہد کے پیچھے اگر کسی شخص نے اُس کی بیوی اور اس کے گھر والوں کے معاملہ میں خیانت کی تو قیامت کے روز وہ اُس مجاہد کے سامنے کھڑا کر دیا جائے گا اور اُس کو کہا جائے گا کہ اس کی نیکیوں میں سے جو کچھ تو چاہے لے لے۔‘‘

پھر آپ ﷺ نے ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمایا: ’’پھر تمہارا کیا خیال ہے؟‘‘ یعنی تم کیا اندازہ کرتے ہو کہ وہ اُس کے پاس کیا چھوڑ دے گا؟

بعض اور مفسرین نے کہا ہے کہ تغابن کا لفظ زیادہ تر تجارت کے معاملہ میں بولا جاتا



ہے۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ اس رویے کو جو کافر اور مؤمن اپنی دنیا کی زندگی میں اختیار کرتے ہیں‘ تجارت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ مؤمن اگر نافرمانی کا راستہ چھوڑ کر اطاعت اختیار کرتا ہے اور اپنی جان‘ مال اور محنتیں خدا کے راستے میں کھپا دیتا ہے تو گویا وہ گھاٹے کا سودا چھوڑ کر ایک ایسی تجارت میں اپنا سرمایہ لگا رہا ہے جو آخر کار نفع دینے والی ہے۔ اور ایک کافر اگر اطاعت کی راہ چھوڑ کر خدا کی نافرمانی اور بغاوت کی راہ میں اپنا سب کچھ لگا دیتا ہے تو گویا وہ ایک ایسا تاجر ہے جس نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی ہے اور آخر کار وہ اس کا خسارہ اٹھانے والا ہے۔ دونوں کا نفع اور نقصان قیامت کے روز ہی کھلے گا۔ دنیا میں یہ ہو سکتا ہے کہ مؤمن سراسر گھاٹے میں رہے اور کافر بڑے فائدے حاصل کرتا رہے۔ مگر آخرت میں جا کر معلوم ہو جائے گا کہ اصل میں نفع کا سودا کس نے کیا ہے اور نقصان کا سودا کس نے۔

ایک اور صورت تغابن کی یہ بھی ہے کہ دنیا میں لوگ کفر و فسق اور ظلم و عصیان پر بڑے اطمینان سے آپس میں تعاون کرتے رہتے ہیں اور یہ اعتماد رکھتے ہیں کہ ہمارے درمیان بڑی گہری محبت اور دوستی ہے۔ بدکردار خاندانوں کے افراد‘ ضلالت پھیلانے والے پیشوا اور ان کے پیرو‘ چوروں اور ڈاکوؤں کے جتھے‘ رشوت خور اور ظالم افسروں اور ملازمین کے گٹھ جوڑ‘ بے ایمان تاجروں‘ صنعت کاروں اور زمینداروں کے گروہ‘ گمراہی اور شرارت و خباثت برپا کرنے والی پارٹیاں اور بڑے پیمانے پر ساری دنیا میں ظلم و فساد کی علمبردار حکومتیں اور قومیں‘ سب کا باہمی ساز باز اسی اعتماد پر قائم ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ تعلق رکھنے والے افراد اس گمان میں ہیں کہ ہم ایک دوسرے کے بڑے اچھے رفیق ہیں اور ہمارے درمیان بڑا کامیاب تعاون چل رہا ہے۔ مگر جب یہ لوگ آخرت میں پہنچیں گے تو ان پر یکایک یہ بات کھلے گی کہ ہم سب نے بہت بڑا دھوکا کھایا ہے۔ ہر ایک یہ محسوس کرے گا کہ جسے میں اپنا بہترین باپ‘ بھائی‘ بیوی‘ شوہر‘ اولاد‘ دوست‘ رفیق‘ لیڈر‘ پیر‘ مرید یا حامی و مددگار سمجھ رہا تھا وہ دراصل میرا بدترین دشمن تھا۔ ہر رشتہ داری اور دوستی اور عقیدت و محبت‘ عداوت میں تبدیل ہو جائے گی۔ سب ایک دوسرے کو گالیاں دیں گے‘ ایک دوسرے پر لعنت کریں گے‘ اور ہر ایک یہ چاہے گا کہ اپنے جرائم کی زیادہ سے زیادہ ذمہ داری دوسرے پر ڈال کر اسے سخت سے سخت سزا دلوائے۔

(اخذ و ترتیب: انجینئر حافظ نوید احمد)

---

## درس ۸

# اطاعتِ امر بمقابلہ تنازع فی الامر

انجینئر حافظ نوید احمد☆

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ    بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ
تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ
الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝ (النساء)

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ۭ اِنَّ
اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (الانفال)

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓي اِذَا فَشِلْتُمْ
وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ
يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ
وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (آل عمران)

يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ۭ (آل عمران:۱۵۴)

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ
مَّا حُمِّلْتُمْ ۭ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ۭ وَمَا عَلَي الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝
وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ
كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى
لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ
وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ
وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ (النور)

☆ مرکزی ناظم تعلیم وتربیت تنظیم اسلامی naveed.ahmad@quranacademy.com



## ☆ تمہیدی نکات

۱) منتخب نصاب نمبر۲ کا درسِ ہشتم سورۃ النساء آیت ۵۹‘ سورۃ الانفال آیت ۴۶‘ سورۂ آلِ عمران آیت ۱۵۲ اور آیت ۱۵۴‘ اور سورۃ النور آیات ۵۴ تا ۵۶ کے مطالعہ پر مشتمل ہے۔

۲) اس سے پہلے منتخب نصاب کے مختلف دروس میں ہم پر دینی فرائض کا جامع تصور واضح ہو چکا ہے۔ یہ بات بھی واضح ہو چکی ہے کہ ان فرائض کی ادائیگی بغیر ایک منظم جماعت کے ممکن نہیں۔ یعنی صرف جماعت ہی نہیں بلکہ اس کے لیے ایک منظم (disciplined) جماعت کی ضرورت ہے۔ وہ جماعت جس کا نظم سمع و طاعت ہو — یعنی ﴿وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا﴾ ’’اور سنو اور (بلا چون و چرا) اطاعت کرو‘‘۔

۳) ہمارے لیے یہ سمجھنا بہت ضروری ہے کہ سمع و طاعت کے نظم کے تقاضے کیا ہیں؟ ان تقاضوں کی ادائیگی کی برکات کیا ہیں؟ اسی طرح ان تقاضوں کی ادائیگی سے انحراف کے نقصانات کیا ہیں؟ ان تمام باتوں کے سمجھنے سے ہم دین کی نصرت کے لیے قائم کی گئی جماعت کو مضبوط کر سکیں گے۔ دین کی نصرت کا مشن اور اس کے لیے قائم کردہ جماعت ہمارے لیے ایک مقدس امانت ہے۔ اس جماعت کو مستحکم کرنا اور ایسے طرزِ عمل سے اجتناب کرنا جو اسے نقصان پہنچائے ایک اہم دینی تقاضا ہے۔ اس تقاضے کی ادائیگی کے لیے ہم منتخب مقاماتِ قرآنی کی روشنی میں چند اہم ہدایات اس درسِ ہشتم میں سمجھیں گے۔

۴) درسِ ہشتم کا موضوع ہے: اطاعتِ امر بمقابلہ تنازع فی الامر۔ اطاعت کا مطلب ہے: کہنا ماننا۔ اطاعتِ امر کا مفہوم ہے: حکم ماننا‘ یعنی نظمِ بالا کے احکامات کے مطابق عمل کرنا۔ تنازع کے معنی ہیں: کھینچ تان کرنا‘ جھگڑا کرنا۔ تنازع فی الامر کا مطلب ہے: حکم کے ماننے میں پس و پیش کرنا‘ نظم بالا کے احکامات پر اعتراضات کرنا‘ اُن احکامات پر عمل کے لیے تیار نہ ہونا اور اختلافی آراء پیش کر کے اُن میں ترمیم یا تبدیلی چاہنا۔ اطاعتِ امر نصرتِ دین کے مشن اور اس کے لیے قائم کردہ جماعت کو مستحکم کرتا ہے اور تنازع فی الامر اسے کمزور کر کے منتشر کر دیتا ہے۔ پہلا طرزِ عمل اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے والا ہے اور دوسرا رویہ شیطان کو خوش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم ایسا طرزِ عمل اختیار کریں جس سے وہ راضی ہو جائے۔ آمین!

# آیات پر غور و فکر

## سورۃ النساء' آیت ۵۹

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا﴾ ''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو!''...... ﴿اَطِیۡعُوا اللّٰهَ﴾ ''اطاعت کرو اللہ کی''...... ﴿وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ﴾ ''اور اطاعت کرو رسول کی''...... ﴿وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡكُمۡ﴾ ''اور اُن کی جو صاحبِ اختیار ہیں تم میں سے''...... ﴿فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ﴾ ''پھر اگر تم جھگڑ پڑو کسی معاملے میں''...... ﴿فَرُدُّوۡهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوۡلِ﴾ ''تو لوٹا دو اُسے اللہ اور رسولؐ کی طرف''...... ﴿اِنۡ كُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ﴾ ''اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ اور آخرت کے دن پر''...... ﴿ذٰلِكَ خَيۡرٌ وَّاَحۡسَنُ تَاۡوِيۡلًا۝﴾ ''یہی بہتر ہے اور عمدہ ہے انجام کے لحاظ سے۔''

◆ اِس آیت میں نظم کا یہ تقاضا بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی' رسول اللہ ﷺ کی اور اصحابِ امر کی اطاعت کی جائے۔ اصحابِ امر سے مراد وہ لوگ ہیں جنہیں کسی اجتماعیت کا نظام چلانے کے لیے امیر جماعت یا سربراہِ ریاست مختلف امور پر ذمہ دار مقرر کرتا ہے۔ بعض اوقات وہ ذمہ دار اپنے کام میں سہولت کے لیے مختلف ذیلی شعبے قائم کر کے اُن کے ذمہ دار مقرر کر دیتا ہے۔ گویا اب ذمہ داران یا اصحابِ امر کا ایک سلسلہ (Chain of command) قائم ہو جاتا ہے۔ اب جو لوگ بھی کسی ذمہ دار کے ماتحت کام کرتے ہیں اُن پر لازم ہے کہ اُس کی اطاعت کریں۔

◆ اِس آیتِ مبارکہ میں اصحابِ امر کی اطاعت میں ایک استثناء کی طرف بھی رہنمائی ہے۔ آیتِ مبارکہ میں اَطِیۡعُوۡا (اطاعت کرو) کے الفاظ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور رسول ﷺ کے ساتھ آئے ہیں' لیکن اصحابِ امر کے ساتھ نہیں آئے۔ یہ اِس بات کی دلیل ہے کہ مطلق اور غیر مشروط اطاعت صرف اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی ہے' جبکہ اصحابِ امر کی اطاعت صرف اِس صورت میں ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کی اطاعت کے تابع ہو۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

((لَا طَاعَةَ لِمَخۡلُوۡقٍ فِیۡ مَعۡصِيَةِ الۡخَالِقِ)) (سنن ابی داوٗد)

''اطاعت نہیں کی جائے گی مخلوق کی خالق کی نافرمانی میں۔''



◆ اگر صاحبِ امر کا فیصلہ قرآن وسنت کے خلاف نہ ہو تو پھر اُسے قبول کرنا اور اُس پر عمل کرنا ہم پر لازم ہے' خواہ وہ ہماری رائے اور خواہش کے برعکس ہی کیوں نہ ہو۔ اُس فیصلے کو نہ صرف قبول کرنا ہے بلکہ کامیاب بنانے کی بھرپور کوشش کرنا بھی ضروری ہے۔ نظم کی اِس طرح سے پابندی ہی نظم جماعت کی اصل روح اور اِس کے لیے ریڑھ کی ہڈی ہے۔

◆ ﴿اُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡكُمۡ﴾ کے الفاظ واضح کرتے ہیں کہ اصحابِ امر کا مسلمانوں میں سے ہونا لازم ہے۔ گویا اسلام میں اصلاً غیر مسلم کی اطاعت کا کوئی تصور موجود نہیں ہے اور نہ ہی کوئی مسلمان کسی غیر مسلم حکومت کا وفادار ہو سکتا ہے۔ ہاں اگر کہیں غیر مسلم زبردستی قابض ہو جائے تو مجبوراً اور اضطراراً اُس کی اطاعت کی جا سکتی ہے' جیسے بھوک سے مرتا انسان مجبوری میں حرام کھا سکتا ہے۔ ایک دینی جماعت میں تو غیر مسلم ہوتے ہی نہیں کہ اُن کے اصحابِ امر بننے کا سوال پیدا ہو۔ اسلامی ریاست میں بھی ایسے تمام امور کا ذمہ دار کسی مسلمان ہی کو بنایا جائے گا جہاں احکامات میں حلال وحرام کی تمیز ملحوظ رکھنی ہو گی۔ البتہ فنی اور پیشہ وارانہ شعبہ جات کی ذمہ داری پر کسی غیر مسلم کو بھی فائز کیا جا سکتا ہے۔

◆ اصحابِ امر سے اگر مامورین کا کسی معاملہ میں اختلاف ہو تو حکم دیا گیا کہ قرآن وسنت سے رہنمائی حاصل کر کے اختلاف کا حل نکالا جائے۔ اختلافی معاملہ بھی دو طرح کا ہو سکتا ہے۔ ایک یہ کہ اختلاف حلال وحرام کا نہ ہو بلکہ صرف ترجیح کا ہو۔ مامور کی رائے میں زیادہ مناسب ایک راستہ اختیار کرنا ہو اور امیر کی رائے میں دوسرا راستہ۔ اب اگر امیر اپنی رائے کے مطابق فیصلہ کرتا ہے تو اِس صورت میں نظم کا تقاضا ہے کہ مامور اپنی رائے کی قربانی دے کر امیر کے فیصلہ کو قبول کر لے۔ اختلافی معاملہ کی دوسری قسم یہ ہو سکتی ہے کہ اختلاف کی نوعیت حلال و حرام یا جائز و ناجائز کی ہو۔ ایسے اختلاف کی صورت میں معاملہ کو درجہ بدرجہ chain of command کے ذریعہ امیر جماعت تک پہنچایا جائے۔ اب اگر اختلاف کرنے والا مامور' امیر جماعت کے دلائل سے قائل ہو جائے یا امیر جماعت مامور کے دلائل کو تسلیم کر لے تو اختلاف ختم ہو جائے گا' اور اگر دونوں میں سے کوئی قائل نہیں ہوتا تو جماعت میں اُس فیصلہ پر عمل درآمد ہو گا جو امیر جماعت کرے گا۔ جو مامور بھی اِس فیصلے کو قرآن وسنت سے واضح دلیل کی بنیاد پر شریعت کے خلاف سمجھے گا اُس کے لیے راستہ کھلا ہو گا کہ وہ جماعت سے علیحدگی اختیار کر لے۔

◆ آیت مبارکہ کے آخر میں ارشاد ہوا کہ مذکورہ بالا اصولوں کی پیروی کرنا ایمان کا

لازمی تقاضا ہے۔ مسلمان ہونے کا دعویٰ اور اِن اصولوں سے انحراف‘ یہ دونوں چیزیں ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتیں۔ دوسرے یہ کہ اِن اصولوں پر اپنے اجتماعیت کا نظام تعمیر کرنے ہی میں مسلمانوں کی بہتری ہے۔ صرف یہی ایک چیز اُن کو دنیا میں صراطِ مستقیم پر قائم رکھ سکتی ہے‘ اُن کی جِدّوجُہد کو کامیاب اور نتیجہ خیز بنا سکتی ہے اور اِسی سے اُن کی عاقبت بھی سنور سکتی ہے۔

## سورۃ الانفال‘ آیت ۴۶

﴿وَاَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ﴾ ’’اور اطاعت کرو اللہ کی اور اُس کے رسولؐ کی‘‘ ......﴿وَلَا تَنَازَعُوۡا﴾ ’’اور آپس میں نہ جھگڑو‘‘ ...... ﴿فَتَفۡشَلُوۡا وَتَذۡہَبَ رِیۡحُکُمۡ﴾ ’’ورنہ تم کم ہمت ہو جاؤ گے اور اُکھڑ جائے گی تمہاری ہوا‘‘ ......﴿وَاصۡبِرُوۡا﴾ ’’اور صبر کرو‘‘ ......﴿اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ ۝﴾ ’’بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔‘‘

◆ اس آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ جہاں تک اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا تعلق ہے تو وہ ہوتی ہی ہے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کے ذریعے۔ اللہ تعالیٰ کے تمام احکامات انسانوں تک آپ ﷺ کے ذریعہ ہی پہنچے ہیں۔ پھر اِن احکامات کی اطاعت کا عملی نمونہ بھی آپ ﷺ ہی پیش کر سکتے ہیں۔ لہٰذا عملی طور پر اس آیت میں آپ ﷺ کی اطاعت کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔

◆ مسلمانوں کے لیے رسول اللہ ﷺ کی کئی حیثیتیں تھیں۔ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول تھے‘ حاکم تھے‘ قاضی تھے‘ سپہ سالار تھے اور مسلمانوں کی جماعت کے امیر بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ کا رسول ہونے کی حیثیت تو بلاشبہ تمام حیثیتوں سے بالاتر ہے۔ اِسی لیے اِس حیثیت کو قرآنِ حکیم میں سب سے زیادہ نمایاں کیا گیا ہے‘ کیونکہ یہ سب سے اعلیٰ‘ سب سے اہم اور سب سے بلند ہے۔ اِس کے بعد آپ ﷺ کی اہم تر حیثیت امیرِ جماعت کی تھی اور اِس حیثیت میں آپ ﷺ بار بار مختلف معاملات میں مسلمانوں کو احکامات و ہدایات دیتے تھے۔ گویا اِس آیت میں اب تا قیامِ قیامت رہنمائی یہ ہے کہ اپنے امیر کی اطاعت کرو۔ البتہ یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ آپ ﷺ کے بعد کسی کی اطاعت اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کے تابع رہ کر صرف معروف کے دائرے میں ہوگی۔

◆ امیر کی اطاعت ہی نظم جماعت ہے اور بغیر نظم کے کوئی اجتماعیت جماعت کہلانے کی حق دار ہے ہی نہیں۔ پھر اصل نظم یہ ہے کہ اپنے سے اوپر کے امیر کی اطاعت کی جائے۔ پوری



جماعت کے امیر کی اطاعت کرنا نسبتاً آسان ہے‘ جبکہ اپنے سے اوپر کے نقیب یا امیر کی اطاعت کرنا مشکل ہوتی ہے۔ بعض اوقات انسان سمجھتا ہے کہ میں عمر یا تجربہ یا علم یا جماعت میں شمولیت کے اعتبار سے اپنے نقیب یا امیر سے آگے ہوں۔ اِس سب کے باوجود نظم یہی ہے کہ خواہ مشکل ہو یا آسانی‘ طبیعت میں آمادگی ہو یا نہ ہو‘ بہر حال اپنے سے اوپر کے ذمہ دار کی اطاعت کرنی ہے۔

◆ آیتِ مبارکہ میں مزید ہدایت دی گئی کہ تنازع مت کرو۔ تنازع یہ ہے کہ مشورہ دینے کے بعد یہ چاہنا کہ اُس پر عمل بھی ہو۔ اپنی رائے کو امیر سے منوانے کی کوشش کرنا‘ امیر کے اوپر دباؤ ڈالنا کہ فیصلہ ہماری رائے کے مطابق کیا جائے۔ اس روش سے کھینچ تان ہوتی ہے‘ نظم ٹوٹ جاتا ہے اور اجتماعیت محض ایک ہجوم بن جاتی ہے۔ ہمیں دیانت داری سے مشورہ دے دینا چاہیے اور امیر کے لیے دعا کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اُسے صحیح فیصلہ تک پہنچنے کی ہدایت عطا فرمائے۔

◆ امیر کے ساتھ تنازع کا نقصان یہ ہوگا کہ جماعت میں شامل ساتھی ’فشل‘ کا شکار ہو جائیں گے۔ ’فَشَلَ‘ کا مطلب ہے کسی چیز کا ڈھیلا پڑ جانا۔ انسان کی ایسی کیفیت کہ وہ کسی کام کو کرنے کی اپنے اندر ہمت ہی نہ پائے۔ یعنی اگر تم نے کھینچ تان شروع کر دی تو تمہاری ہمت ختم ہو جائے گی اور تم ڈھیلے پڑ جاؤ گے۔ کسی تحریک کے لیے اِس سے زیادہ مہلک صورتِ حال نہیں ہوسکتی۔ اب جماعت کی ہوا اکھڑ جائے گی۔ کفار و مشرکین پر سے اُس کا رعب اور دبدبہ ختم ہو جائے گا۔ جماعتی نظم کا ڈھیلا پڑنا اُس مقصد کو نقصان پہنچانے کا سبب بن جائے گا جس کے لیے جماعت قائم ہوئی تھی۔ وہ مقصد ہے اقامت دین کی جدوجہد۔ گویا نظم کو توڑ کر ہم اقامت دین کی جدوجہد کے عظیم مشن کو نقصان پہچانے کا جرم کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسا تخریبی کام کرنے سے محفوظ فرمائے۔ آمین!

◆ آیت کے آخر میں ارشاد ہوا کہ صبر کرو‘ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ صبر کے کئی پہلو ہیں‘ مثلاً حادثات پر صبر‘ نیکی کرنے کے لیے صبر‘ گناہوں سے بچنے کے لیے صبر۔ یہاں صبر سے مراد ہے: اطاعتِ امر کے لیے صبر‘ یعنی اللہ تعالیٰ‘ اُس کے رسول ﷺ اور اصحابِ امر کی اطاعت پر صبر۔ اپنی رائے کے خلاف فیصلہ قبول کرنا بغیر صبر کے ممکن نہیں۔ شیطان بار بار اُکساتا ہے کہ امیر نے اچھی طرح سے تمہاری بات سنی نہیں یا تمہاری رائے کو

اہمیت ہی نہیں دی۔ اب انسان اپنی رائے منوانے کے لیے اصرار کرتا ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو امیر سے لڑنا شروع کر دیتا ہے۔ صبر یہ ہے کہ ہم نے شیطان کے حملہ کا مقابلہ کرنا ہے اور امیر کی طرف سے معروف کے دائرے میں کیے گئے ہر فیصلہ کو نہ صرف قبول کرنا ہے بلکہ اُسے کامیاب بنانے کی اپنی سی پوری کوشش کرنی ہے۔

◆ اصحابِ امر کی اطاعت پر صبر کرنا آسان نہیں بلکہ بہت مشکل ہے۔ البتہ خوشخبری یہ ہے کہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ﴾ ’’یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے‘‘۔ یعنی اللہ کی رضا اور نظرِ کرم نظم کی پابندی کرنے والوں کو حاصل ہوگی۔

## سورۂ آلِ عمران‘ آیت ۱۵۲

﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ﴾ ’’اور یقیناً سچ کر دکھایا تم سے اللہ نے اپنا وعدہ‘‘ ...... ﴿اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ﴾ ’’جب تم قتل کر رہے تھے کافروں کو اُس کے حکم سے‘‘ ...... ﴿حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ﴾ ’’یہاں تک کہ تم ڈھیلے پڑ گئے‘‘ ...... ﴿وَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ﴾ ’’اور تم نے باہم جھگڑا کیا فیصلے کے بارے میں‘‘ ...... ﴿وَعَصَيْتُمْ﴾ ’’اور تم نے نافرمانی کی‘‘ ...... ﴿مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ﴾ ’’اِس کے بعد کہ اللہ نے دکھایا تمہیں وہ جسے تم پسند کرتے تھے (یعنی فتح)‘‘ ...... ﴿مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا﴾ ’’تم میں سے کچھ چاہتے تھے دنیا (کی فتح)‘‘ ...... ﴿وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ﴾ ’’اور تم میں سے کچھ چاہتے تھے آخرت‘‘ ...... ﴿ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ﴾ ’’پھر اللہ نے پھیر دیا تمہیں اُن سے تاکہ وہ تمہیں آزمائے‘‘ ...... ﴿وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ﴾ ’’اور یقیناً اللہ نے تمہیں معاف کر دیا‘‘ ...... ﴿وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ ’’اور اللہ بہت فضل کرنے والا ہے مؤمنوں پر۔‘‘

◆ اِس آیت میں تنازع فی الامر کے نقصان کی ایک عملی مثال پیش کی گئی ہے۔ معرکۂ اُحد میں مسلمانوں کی فتح شکست میں بدل گئی۔ ابتدا میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نصرت کا وعدہ پورا فرمایا۔ مسلمانوں کو کافروں پر حاوی کر دیا اور وہ اُنہیں گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے تھے۔ پھر مسلمانوں کی طرف سے نظم کی خلاف ورزی ہوئی اور پانسہ پلٹ گیا۔ مسلمانوں کو بڑی زک پہنچی‘ شدید نقصان ہوا‘ ستر (۷۰) صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین شہید ہوئے‘ نبی اکرم ﷺ کے دندانِ مبارک شہید ہوئے اور چہرۂ مبارک لہولہان ہوگیا۔

◆ دراصل غزوۂ اُحد میں ﴿فَتَفْشَلُوْا﴾ والی بات سامنے آئی‘ یعنی مسلمان فتح دیکھ کر



ڈھیلے پڑے اور پھر ﴿تَذْهَبَ رِيْحُكُمْ﴾ والی بات بھی ہوگئی‘ یعنی مسلمانوں کا کافروں پر رعب ختم ہوگیا۔ اب مسلمانوں کو دعوتِ فکر دی جارہی ہے کہ ذرا غور کرو ایسا کیوں ہوا؟ کیا اللہ تعالیٰ نے تمہارا ساتھ چھوڑ دیا تھا؟ نہیں‘ وہ تو تمہاری بھرپور مدد فرما رہا تھا۔ تم اپنے سے چار گنا بڑے لشکر پر فتح حاصل کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ تم خود ڈھیلے پڑے‘ تم نے اپنے امیر سے تنازع کیا اور اُس کی نافرمانی کی۔ تمہاری اکثریت اپنے امیر کے منع کرنے کے باوجود اُس درّہ سے نیچے اُتر آئی جس پر تمہیں کھڑے رہنے کا تاکیدی حکم دیا گیا تھا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں سورۃ الانفال میں پہلے ہی نصیحت کر دی تھی کہ اصحابِ امر سے نہ جھگڑنا ورنہ تم ڈھیلے پڑ جاؤ گے اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی۔ تم نے نظم کی پابندی نہیں کی اور اِس کا نتیجہ دیکھ لیا۔ درّے کے راستے دشمن نے پیچھے سے حملہ کیا اور تمہیں شدید نقصان پہنچایا۔ اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں نظم کی پابندی کی کیا اہمیت ہے۔

◆ اِس آیت میں مزید ارشاد ہوا کہ تم میں سے کچھ دنیا کے طلب گار تھے اور کچھ آخرت کے۔ یہاں دنیا سے مراد مالِ غنیمت نہیں‘ کیونکہ اُس کے بارے میں تو ضابطہ غزوۂ بدر کے بعد طے ہو چکا تھا۔ اِس ضابطہ کے مطابق کل مالِ غنیمت نبی اکرم ﷺ کے پاس جمع کرا دیا جائے گا۔ آپ ﷺ پانچواں حصہ اپنے قرابت داروں اور محتاجوں کے لیے رکھ لیں گے اور چار حصے مجاہدین میں تقسیم فرما دیں گے۔ لہٰذا یہاں دنیا سے مراد مالِ غنیمت نہیں بلکہ دنیوی فتح ہے‘ جیسے سورۃ الصّف آیت ۱۳ میں ارشاد ہوا: ﴿وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ۭ﴾ ’’اور ایک اور نعمت ہے جسے تم پسند کرتے ہو‘ مدد اللہ کی طرف سے اور جلد آنے والی فتح۔‘‘

◆ اِس آیت میں آگاہ کر دیا گیا کہ یہ دنیوی فتح کی طلب ہے جس سے لوگ اصولوں اور نظم کی پابندیوں سے ہٹ جاتے ہیں۔ مؤمن کا مقصود و مطلوب تو رضائے الٰہی اور فلاحِ اُخروی کا حصول ہونا چاہیے۔ اصل کامیابی تو یہ ہے کہ دنیا میں نتائج کی پروا کیے بغیر اللہ تعالیٰ کی راہ میں تن من دھن لگا دیا جائے۔ جہاں جلد سے جلد فتح حاصل کرنے کی طلب پیدا ہوگی اور عجلت پسندی کا مظاہرہ کیا جائے گا وہیں اصولوں سے انحراف ہوگا اور ایسا نقصان ہوگا کہ منزل قریب آنے کے بجائے اور دور ہو جائے گی۔ اصل کامیابی تو آخرت کے دن کی کامیابی ہے‘ یعنی ﴿ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ۭ﴾ (التغابن:۹) ’’وہ ہوگا اصل ہار اور جیت کے فیصلے کا دن‘‘۔ یہاں کی ہار‘ ہار نہیں‘ یہاں کی جیت‘ جیت نہیں۔ دنیا کی کامیابی کی کوئی غرض ہی نہ رکھی جائے بلکہ

احساسِ فرض کے تحت حرکت کی جائے۔ دنیا میں کامیابی کا کتنے فیصد امکان ہے اور کتنے فیصد نہیں ہے' یہ حساب کتاب نہ رکھا جائے۔ صد فیصد ناکامی کا یقین ہو تب بھی ہم جدوجہد کرتے رہیں گے اگر ہمارا مطلوب صرف آخرت ہے۔ لہٰذا ہمارا نصب العین صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور اُخروی فلاح ہونا چاہیے نہ کہ انقلاب لانا یا اقامت دین کی منزل حاصل کرنا۔ جہاں یہ چیزیں نصب العین کے درجہ میں آئیں گی وہاں غلطیاں ہو کر رہیں گی۔

◆ آیت کے آخر میں ارشاد ہوا کہ پھر اللہ تعالیٰ نے تمہیں پھیر دیا اُن سے' تاکہ وہ تمہیں آزمائش میں ڈالے۔ تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو اور تم آئندہ کے لیے اپنی اصلاح کر سکو۔ تمہاری اِس غلطی سے درگزر بھی کیا جا سکتا تھا لیکن پھر یہ غلطی تمہارے اندر راسخ ہو جاتی۔ یہ سرزنش اِس لیے ضروری تھی تاکہ ایک دفعہ بات واضح ہو جائے کہ نظم کی پابندی کی کیا اہمیت ہے۔ البتہ اہلِ ایمان کو تسلی دی گئی کہ اللہ تعالیٰ واقعی تمہیں معاف فرما چکا ہے۔ اب تمہارے لیے آخرت کی کوئی سزا نہیں ہے' جو بھی سرزنش تھی یہیں ہو گئی۔

## سورۂ آلِ عمران' آیت ۵۴

﴿یَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ﴾ ''کہتے تھے کیا ہمارے لیے بھی ہے اختیار میں سے کچھ'' ...... ﴿قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ﴾ ''(اے نبیﷺ!) فرمایئے بے شک اختیار سب کا سب اللہ ہی کے لیے ہے۔''

◆ اِس آیتِ مبارکہ میں رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی کا ایک اعتراض نقل ہوا ہے۔ غزوۂ اُحد کے موقع پر اُس نے یہ رائے دی تھی کہ مشرکینِ مکہ سے کھلے میدان میں مقابلہ کے بجائے مدینہ میں محصور رہ کر جنگ کی جائے۔ نبی اکرمﷺ کی اپنی رائے بھی یہی تھی' لیکن آپﷺ نے نوجوان صحابہ کرامؓ کے جوشِ ایمان اور ذوقِ شہادت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اُن کی رائے کے مطابق مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ اب عبداللہ بن اُبی اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر الگ ہو گیا۔ بعد میں اُس نے اپنے اِس فرار کا جواز پیش کرنے کے لیے اعتراض کیا کہ میری بات نہ سنی گئی اور نہ مانی گئی۔ کیا معاملات اور اختیارات میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہے؟ اُسے جواب دیا گیا ہے کہ اختیار تو سارے کا سارا اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔ اُس نے اپنے رسولﷺ کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ جس رائے کو بھی چاہیں قبول کر لیں اور اُس کے مطابق فیصلہ کر لیں۔



◆ دراصل شیطان یا نفس ہر انسان میں یہ پھونک مارتا ہے کہ میرے ہاتھ میں بھی کچھ اختیار ہو اور میری رائے کو بھی اہمیت دی جائے۔ کوئی اِس کا اظہار کر دیتا ہے اور کوئی نہیں کرتا۔ اِس طرح کی خواہش نظم جماعت کے حوالے سے انتہائی مہلک ہے۔ اِس خواہش کا اظہار کرنے والے جان لیں کہ ہر معاملہ کا کل اختیار صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ اُس نے اپنے رسولﷺ اور اصحابِ امر کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ مامورین کی ذمہ داری بس یہ ہے کہ وہ خلوص کے ساتھ اپنی رائے دے دیں۔ پھر معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دیں تاکہ وہ امیر کو درست فیصلہ کی ہدایت عطا فرما دے۔ اب جو رسول اللہﷺ کا فیصلہ تھا تو اُسے دل و جان سے قبول کرنا ہی تھا۔ اِسی طرح اصحابِ امر کے فیصلہ کے مطابق عمل کرنا بھی ضروری ہے اگر وہ فیصلہ معروف کے دائرے میں ہے۔

## سورۃ النور' آیت ۵۴

﴿قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ ''(اے نبیﷺ!) فرمایئے اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی'' ...... ﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْهِ مَا حُمِّلَ﴾ ''پھر اگر تم نے رخ پھیر لیا تو رسولؐ کے ذمہ اتنا ہی ہے جو اُن پر لازم کیا گیا'' ...... ﴿وَعَلَیْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ﴾ ''اور تمہارے ذمہ ہے جو تم پر لازم کیا گیا'' ...... ﴿وَاِنْ تُطِیْعُوْهُ تَهْتَدُوْا﴾ ''اور اگر تم اطاعت کرو گے اُن کی تو ہدایت پا جاؤ گے'' ...... ﴿وَمَا عَلَی الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ۝﴾ ''اور نہیں ہے رسولؐ کے ذمہ مگر صاف صاف پہنچا دینا۔''

◆ اِس آیت میں حکم دیا گیا کہ ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسولﷺ کی اطاعت کرو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو رسول اللہﷺ کے ذمہ تو صرف اللہ تعالیٰ کے پیغام کو پہنچا دینے کا حق ادا کر دینا ہے اور تمہارے ذمہ ہے اُسے قبول کرنا اور اُس کے مطابق عمل کرنا۔ اگر بالفرض اُن کی طرف سے پیغام پہنچانے میں کمی رہی تو تم بری ہو جاؤ گے اور اگر اُنہوں نے اپنا کام پورا کر دیا تو پھر وہ بری ہو جائیں گے اور اب ساری پُرسش تمہاری ہو گی۔ یہ بات سورۃ الاعراف میں اِس طرح بیان ہوئی:

﴿فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِیْنَ اُرْسِلَ اِلَیْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِیْنَ ۝﴾

''سو ہم ضرور پوچھیں گے اُن سے بھیجے گئے تھے جن کی طرف رسول اور ہم ضرور پوچھیں گے رسولوں سے۔''

◆ آیتِ مبارکہ میں خوشخبری دی گئی کہ اگر تم رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرو گے تو اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ اس سے تمہیں ہدایت جیسی عظیم نعمت حاصل ہوگی۔ دوسرے الفاظ میں اگر اُن کے ارشادات کو پس پشت ڈال دیا تو گمراہ ہو جاؤ گے۔ قرآن و سنت کو امام بنانا ہدایت کے حصول کا راستہ ہے اور اپنی خواہشات کو امام بنانا دنیا میں دھکے کھانے اور آخرت میں برباد ہونے کا راستہ ہے۔

◆ آیتِ مبارکہ کے آخر میں واضح کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کے ذمہ صرف صاف صاف حق پہنچا دینا ہے۔ آپ ﷺ پورا حق بغیر کسی کمی یا بیشی کے بیان کرتے رہیں گے۔ لوگوں کو راضی رکھنے کے لیے نہ حق میں ترمیم کریں گے اور نہ اُس کے کسی حصہ کو چھپائیں گے۔ آپ ﷺ کی ذمہ داری حق پہنچانا ہے' لوگوں سے حق منوانا نہیں۔

◆ ایک ارشادِ نبوی ﷺ کے مطابق خدمتِ دین کے مشن میں اپنے امیر کی اطاعت کا حکم بھی اسی طرح دیا گیا ہے جیسے اس آیت میں رسول ﷺ کی اطاعت کا۔ یہ اصول ہمیشہ پیشِ نظر رہے کہ آپ ﷺ کے بعد کسی امیر کی اطاعت صرف اُس وقت ہوگی جب اُس کا حکم خلافِ شریعت نہ ہو:

سَاَلَ سَلَمَةُ بْنُ يَزِيْدَ الْجُعْفِيّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: يَا نَبِيَّ اللّٰهِ أَرَاَيْتَ اِنْ قَامَتْ عَلَيْنَا اُمَرَاءُ يَسْأَلُوْنَا حَقَّهُمْ وَيَمْنَعُوْنَا حَقَّنَا، فَمَا تَاْمُرُنَا؟ فَاَعْرَضَ عَنْهُ، ثُمَّ سَأَلَهُ فَاَعْرَضَ عَنْهُ، ثُمَّ سَأَلَهُ فِي الثَّانِيَةِ اَوْ فِي الثَّالِثَةِ فَجَذَبَهُ الْأَشْعَثُ بْنُ قَيْسٍ، وَقَالَ: ((اسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا، فَاِنَّمَا عَلَيْهِمْ مَا حُمِّلُوْا وَعَلَيْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ)) (صحیح مسلم)

سلمہ بن یزید جعفی رضی اللہ عنہ نے اللہ کے رسول ﷺ سے دریافت کیا کہ آپ ﷺ کیا رہنمائی فرماتے ہیں ایسی صورت کے لیے کہ ہمارے امیر ہم سے اپنے حقوق کا تقاضا کریں لیکن بذاتِ خود ہمارے حوالے سے اپنی ذمہ داریاں پوری نہ کریں۔ آپ ﷺ نے اِس سوال کا جواب نہیں دیا۔ اُن صحابیؓ نے دوبارہ پوچھا۔ آپ ﷺ نے پھر جواب نہ دیا۔ اُنہوں نے تیسری بار پوچھا تو حضرت اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ نے اُنہیں کہنی ماری (یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ اللہ کے رسول ﷺ اس سوال کو پسند نہیں فرما رہے)۔ اس بار آپ ﷺ نے جواب دیا کہ ''اُن کے احکامات سنو اور مانو' کیونکہ اُن پر جواب دہی ان کے اپنے فرائض کی ہوگی اور تم پر جواب دہی تمہارے فرائض کی ہے۔''



◆ اِس ارشادِ نبوی ﷺ کی روشنی میں صاحبِ امر بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں مسئول ہے اور اِسی طرح تم بھی۔ امراء کے ذمے جو بھی فرائض اور ذمہ داریاں ہیں وہ ان کے مسئول ہیں۔ اُنہوں نے جلد بازی میں فیصلہ کر لیا یا تمہارے ساتھ وہ طرزِ عمل اختیار نہیں کیا جو کرنا چاہیے تھا تو وہ اِس کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہ ہوں گے۔ اِسی طرح اگر مامورین نے اپنے فرائض ادا نہ کیے تو ان کی پُرسش ہوگی۔

◆ دنیا میں کوئی چیز یک طرفہ تو ہوتی نہیں۔ اگر مامورین کے کچھ فرائض ہیں تو امراء کے بھی فرائض ہیں اور امراء کے حقوق ہیں تو مامورین کے بھی کچھ حقوق ہیں۔ ہونا یہ چاہیے کہ ہر شخص اپنے فرائض کی ادائیگی پر توجہ دے' اپنے حقوق کی طلب کی زیادہ فکر نہ کرے۔ اگر کوئی حق مارا گیا تو دنیوی اعتبار سے تو نقصان ہے' مگر اُخروی اعتبار سے نفع ہے۔ بوجھ تو اُس پر ہے جس نے کسی کا حق مارا ہے۔ آخرت میں حساب کتاب چکا دیا جائے گا اور ہر ایک کو اُس کا حق مل جائے گا۔ اپنے فرائض ادا کرنے والے وہاں کچھ حاصل ہی کریں گے' اُنہیں کچھ دینا نہ پڑے گا۔ یہ نفع کا سودا ہے' نقصان کا نہیں۔ لہٰذا ہر فرد اپنی ذمہ داری کو دیکھے کہ کیا ہے اور وہ اُس میں کوئی کمی تو نہیں کر رہا؟

## سورۃ النور' آیت ۵۵

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ ''وعدہ فرمایا ہے اللہ نے اُن سے جو ایمان لائے تم میں سے اور عمل کرتے رہے اچھے'' ...... ﴿لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ﴾ ''وہ ضرور خلافت دے گا اِنہیں زمین میں'' ...... ﴿كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ ''جس طرح اُس نے خلیفہ بنایا اُنہیں جو اِن سے پہلے تھے'' ...... ﴿وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ﴾ ''اور ضرور غالب کر دے گا اِن کے لیے اِن کے اِس دین کو جو اُس نے پسند کیا اِن کے لیے'' ﴿وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا﴾ ...... ''اور ضرور بدل دے گا اِن کے لیے خوف کی حالت کو امن میں'' ﴿يَعْبُدُوْنَنِيْ﴾ ...... ''وہ میری ہی عبادت کریں گے'' ...... ﴿لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا﴾ ''نہیں شریک کریں گے میرے ساتھ کسی کو'' ...... ﴿وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ﴾ ''اور جو ناشکری کرے گا اِس کے بعد'' ...... ﴿فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝﴾ ''تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں۔''

◆ یہ آیت اقامتِ دین کے لیے جدوجہد کرنے والوں کو امید افزا پیغام اور بڑا حوصلہ

دے رہی ہے۔ اِس آیت میں ایسے مسلمانوں کو خوش کن بشارتیں دی گئی ہیں جو اپنی استطاعت کے مطابق ایمان اور اعمالِ صالحہ کا حق ادا کر دیں۔ ایمان سے مراد محض زبانی اقرار نہیں بلکہ قلبی اور حقیقی ایمان ہے۔ اِسی طرح اعمالِ صالحہ سے مراد صرف عبادات نہیں بلکہ تمام دینی فرائض کی ادائیگی ہے۔

◆ اِس آیتِ مبارکہ میں ایمان لانے اور اعمالِ صالحہ کرنے والوں کو تین بشارتیں دی گئی ہیں:

(i) اللہ تعالیٰ اُنہیں زمین میں خلافت عطا فرمائے گا۔

(ii) اللہ تعالیٰ ضرور غالب فرما دے گا اِن کے لیے اِن کے اِس دین کو جو اُس نے پسند کیا ہے اِن کے لیے۔

(iii) اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے لیے خوف کی حالت کو امن سے بدل دے گا۔

◆ مذکورہ بالا بشارتیں پوری ہونے کے بعد لوگ واقعی اللہ تعالیٰ کی عبادت یعنی زندگی کے انفرادی و اجتماعی ہر معاملہ میں اُس کی اطاعت کر سکیں گے۔ گویا نظامِ خلافت کے قیام کے بغیر ہماری عبادت ادھوری اور ناقص ہے۔

◆ صحابہ کرام ؓ کو یہ بشارتیں ۶ھ میں دی گئیں۔ اُنہوں نے ایمان اور اعمالِ صالحہ کا حق ادا کیا اور دو سال بعد ۸ھ میں فتح مکہ کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے مذکورہ بالا تمام وعدے پورے ہو گئے۔ گویا یہ آیت خلافتِ راشدہ کی حقانیت پر واضح دلیل ہے۔ خلافت عطا کرنے کا یہ وعدہ جن صالحین سے پورا ہوا وہ واقعی ایمان اور عملِ صالح کے اعلیٰ ترین معیار پر تھے۔ اِس طرح گویا اللہ تعالیٰ نے بذاتِ خود چاروں خلفائے راشدین ؓ کے پاکیزہ کردار کی گواہی دی ہے۔

◆ اقامتِ دین کے لیے جو سعادت مند اِس وقت جدوجہد کر رہے ہیں اُن کے لیے بھی مذکورہ بالا بشارتیں ایک بار پھر پوری ہونے والی ہیں۔ حضرت نعمان بن بشیر ؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا:

((تَكُوْنُ النُّبُوَّةُ فِيْكُمْ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا اللّٰهُ اِذَاشَاءَ اَنْ يَّرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُوْنُ خَلَافَةً عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ، فَتَكُوْنُ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اَنْ يَّرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا عَاضًا، فَيَكُوْنُ مَاشَاءَ اللّٰهُ



اَنْ تَكُوْنَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَّرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا جَبْرِيًّا، فَتَكُوْنُ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا اِذَاشَاءَ اَنْ يَّرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُوْنُ خَلَافَةً عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ)) ثُمَّ سَكَتَ (مسند احمد)

’’(اے مسلمانو!) نبوت تمہارے درمیان رہے گی جب تک اللہ چاہے گا۔ (یعنی نبی کریم ﷺ کی بنفسِ نفیس موجودگی) پھر نبوت کے طریقہ پر خلافت کا دور آئے گا‘ یہ دور بھی اُس وقت تک رہے گا جب تک اللہ چاہے گا‘ پھر اُسے اُٹھا لے گا۔ پھر کاٹ کھانے والی بادشاہت ہوگی جو اُس وقت تک رہے گی جب تک اللہ چاہے گا‘ پھر اسے بھی ختم کر دے گا۔ پھر مجبوری کا دورِ حکومت ہوگا جو اُس وقت تک رہے گا جب تک اللہ چاہے گا‘ پھر اسے بھی ختم کر دے گا۔ پھر نبوت کے طریقے پر خلافت کا دور آئے گا‘‘۔ پھر آپ ﷺ خاموش ہو گئے۔

◆ البتہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے اتنے پختہ وعدوں کے باوجود کفرانِ نعمت کریں اور ایمان اور عملِ صالح کی شرائط پوری کرنے کی طرف توجہ نہ دیں تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں فاسق شمار ہوں گے۔ اِسی طرح جو لوگ قیامِ خلافت کے بعد بھی کفر پر اڑے رہیں اور حالتِ کفر ہی میں مر جائیں تو وہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ فاسق یعنی اللہ تعالیٰ کے باغی ہیں۔

## سورۃ النور‘ آیت ۵۶

﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ ’’اور قائم کرو نماز اور ادا کرو زکوٰۃ‘‘......

﴿وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝﴾ ’’اور اطاعت کرو رسولؐ کی تاکہ تم پر رحم کیا جائے‘‘۔

◆ اِس آیت مبارکہ میں ارشاد ہوا کہ اگر دینی ذمہ داریوں اور اِن کی ادائیگی کے لیے تمہیں نظمِ جماعت کی اہمیت کا احساس ہو گیا ہے تو اب اعمالِ صالحہ کا آغاز کر دو۔ اعمالِ صالحہ کے زینے کی پہلی سیڑھی ارکانِ اسلام کی پابندی ہے۔ پہلی سیڑھی پر قدم جماؤ گے تو دوسری پر چڑھنے کا امکان ہوگا۔ اگر یہیں پر قدم لرز رہے ہیں اور تمہیں استقامت حاصل نہیں تو اگلی کا کیا سوال؟ لہٰذا نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔ اب اگلی سیڑھی یہ ہے کہ زندگی کے جملہ معاملات میں اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو۔ واضح رہے کہ یہاں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت صرف رسول کی حیثیت میں مراد نہیں ہے‘ بلکہ امیر کی حیثیت میں بھی‘ سپہ سالار کی حیثیت میں بھی‘ چیف ایگزیکٹو کی حیثیت سے بھی اور چیف جسٹس کی حیثیت سے بھی مراد ہے۔ اب جو بھی اصحابِ

امر ہیں اُن کی معروف کے دائرے میں اطاعت کرتے ہوئے دینی فرائض کی ادائیگی کی کوشش کی جائے گی۔

◆ سورۃ النور کی اِس آیت میں وہی اسلوب ہے جو سورۃ الحج کی آخری دو آیات میں ہے۔ اِن آیات میں دینی فرائض بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوا:

﴿فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿۷۸﴾﴾

''پس قائم کرو نماز اور دو زکوٰۃ اور چمٹ جاؤ اللہ کے ساتھ۔ وہ کارساز ہے تمہارا۔ پس کیا خوب کارساز ہے اور کیا خوب مددگار ہے!''

◆ آیتِ مبارکہ کے آخر میں آگاہ کیا گیا کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تم پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں نازل ہوں تو خلوصِ دل کے ساتھ دینی فرائض کی ادائیگی کا آغاز کرو اور اِس کے لیے جماعتی نظم کی پابندی کرو۔

۞۞۞


بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے دو فکر انگیز خطابات پر مشتمل کتابچہ

**توبہ کی عظمت اور تاثیر**

**اور موجودہ حالات میں کرنے کا اصل کام**

اشاعتِ خاص: 65روپے    اشاعتِ عام: 35روپے

# اخلاصِ نیّت اور ریاکاری

جمیل الرحمٰن عباسی ☆

نیت کا لفظی معنی ارادہ یا قصد ہے۔ نیت سے تمیز یعنی دو چیزوں میں فرق واضح ہوتا ہے۔

اولاً نیت سے ایک عبادت کو دوسری عبادت سے ممتاز کیا جاتا ہے‘ جیسے نیت کے ذریعے قضا روزے اور نفلی روزے میں فرق و تمیز کی جاتی ہے۔ کبھی نیت امورِ عبادت کو امورِ عادیہ (وہ امور جو ہم بشری تقاضوں کے تحت سرانجام دیتے ہیں) سے ممتاز کرتی ہے‘ جیسے بغرضِ پرہیز وعلاج کھانے پینے سے رکنے اور روزے میں نیت کے ذریعے فرق کیا جاتا ہے۔ کبھی نیت سے نیک اعمال کے مقصودِ اصلی میں اس اعتبار سے تمیز کی جاتی ہے کہ ان اعمال کا مقصود کیا ہے؟ آیا اللہ کی رضا اور اجر وثواب مقصود ہے یا کسی اور شخصیت کی خوشنودی یا دُنیوی منفعت مقصود ہے۔ اخلاصِ نیت کا لفظ بالعموم اسی آخری قسم کے لیے استعمال ہوتا ہے اور ریا یا سُمعہ کا تعلق بھی اسی قسم سے ہے۔

نیت کے پہلے دو مفاہیم سے فقہائے کرام بحث کرتے ہیں (کتب فقہ یا علمائے کرام سے یہ مسائل سیکھنے چاہئیں)‘ جبکہ نیت کے دوسرے مفہوم سے صوفیائے کرام یا علمائے اخلاق بحث کرتے ہیں اور یہی مفہوم اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔ (ملخص از دستور العلماء‘ لقاضی عبدالنبی احمد نگریؒ ‘جامع العلوم و الحکم لابن رجب الحنبلیؒ)

## اصل آزمائش

اللہ تعالیٰ نے انسان سے مجرد عمل کا نہیں بلکہ حسنِ عمل کا مطالبہ کیا ہے۔ سورۂ ہود‘ سورۃ الکہف اور سورۃ الملک میں زمین و آسمان‘ سلسلہ حیات و اموات اور کائنات کی رنگینیوں کی تخلیق کے ذکر کے بعد ان سب کا مقصود بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ؕ﴾ ”تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے اچھا عمل کرنے والا کون ہے؟“ گویا آزمائش صرف عمل میں نہیں بلکہ حسنِ عمل میں ہے۔ جو اپنے عمل کو حسین کر کے دکھائے گا وہی اس آزمائش میں کامیاب ہوگا۔

☆ معاون مرکزی ناظم تعلیم وتربیت tarbiah.s@tanzeem.org



## حسنِ عمل کیا ہے؟

حضرت فضیل بن عیاضؒ سے کسی نے حسنِ عمل کا مطلب پوچھا تو فرمایا: ”جو عمل درست بھی ہو اور خالص بھی ہو“ — خالص کا مطلب یہ ہے کہ وہ کام صرف اللہ ہی کے لیے کیا جائے اور درست ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ سنت کے معیار پر بھی پورا اترتا ہو (مدارج السالکین)۔

علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: ”اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول عمل کے دو لازمی ارکان ہیں‘ ایک یہ کہ وہ شریعت کے مطابق ہو اور دوسرے یہ کہ وہ کام صرف اللہ ہی کے لیے کیا جائے“ (تفسیر ابن کثیر)۔

حاصل کلام یہ ہے کہ حسنِ عمل میں جہاں کسی عمل کا ظاہری طور پر شریعت اور سنت کے مطابق ہونا ضروری ہے وہیں اس عمل کا خالصتاً اللہ کے لیے ہونا یعنی نیت کا خالص ہونا بھی ضروری ہے۔

یہ بات طے ہے کہ اصلاحِ نیت کے بغیر عمل کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ امام ابن قیمؒ نے یہ بات واضح کرنے کے لیے بہت خوبصورت انداز اختیار کیا‘ فرماتے ہیں: ”سنت کی پیروی اور اخلاص کے بغیر عمل کرنے والے کی مثال ایک ایسے مسافر کی سی ہے جو اپنے بیگ میں سنگریزے بھرلے‘ جنہیں اٹھائے تو پھرے لیکن وہ سنگریزے اسے کچھ فائدہ نہ پہنچا سکیں۔“ (الفوائد)

## اعمال کی باطنی کیفیت فیصلہ کُن ہے!

حقیقت یہ ہے کہ انسانی اعمال کی قبولیت میں انسان کی باطنی کیفیت فیصلہ کن ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿لَنۡ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوۡمُہَا وَ لَا دِمَآؤُہَا وَ لٰکِنۡ یَّنَالُہُ التَّقۡوٰی مِنۡکُمۡ ؕ﴾ (الحج:۳۷) ”اللہ کو تمہارے گوشت یا خون نہیں پہنچتے بلکہ اس تک تو تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔“

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ’تقویٰ پہنچنے‘ کی تفسیر میں فرمایا کہ انسان کی نیتیں اللہ تک پہنچتی ہیں (بستان العارفین للنوویؒ)۔ اس حوالے سے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی صُوَرِکُمْ وَاَمْوَالِکُمْ وَلٰکِنْ یَنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ وَاَعْمَالِکُمْ)) (صحیح مسلم)

”بے شک اللہ نہ تو تمہاری صورتوں کو دیکھتا ہے اور نہ ہی تمہارے اموال کو دیکھتا ہے بلکہ وہ تو تمہارے قلوب اور اعمال کو دیکھتا ہے۔“

یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عزت کا معیار خوبصورتی یا مالدار ہونا نہیں بلکہ تقویٰ ہے جس کی بنیاد ایک تو اعمال اور دوسرے قلوب پر ہے۔ قلب سے مراد وہ نیت ہے جو کسی عمل کی بنیاد بنتی ہے۔ چونکہ یہ ایک قلبی عمل ہے اس لیے اس کے لیے لفظ قلب کا استعمال

کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس حدیث کی ایک دوسری روایت میں قلب کے ساتھ ((نِیَّاتِکُمْ)) کا لفظ بھی ملتا ہے کہ وہ تمہاری نیتوں کو دیکھتا ہے۔ (مرقاہ المفاتیح' شرح مشکاۃ المصابیح)

## اعمال کا اجر نیت کے مطابق ملے گا

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ وَاِنَّمَا لِکُلِّ امْرِئٍ مَا نَوٰی ، فَمَنْ کَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ، وَمَنْ کَانَتْ هِجْرَتُهٗ لِدُنْیَا یُصِیْبُهَا اَوِ امْرَاَةٍ یَنْکِحُهَا فَهِجْرَتُهٗ اِلٰى مَا هَاجَرَ اِلَیْهِ)) (متفق علیه)

''بے شک اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور ہر ایک کو وہی کچھ ملے گا جس کی اس نے نیت کی ہوگی۔ پس جس نے اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی طرف ہجرت کی تو اس کی ہجرت اللہ اور رسول (ﷺ) ہی کی طرف شمار ہوگی' اور جس نے دنیا حاصل کرنے کے لیے یا کسی عورت سے شادی کی غرض سے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اسی کے حساب میں لکھی جائے گی جس کی طرف اس نے ہجرت کی۔''

مذکورہ بالا حدیث میں ہجرت کو بطور مثال پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے اعمال کے بارے میں بھی یہی اصول لاگو ہوتا ہے۔ اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت شمار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ہجرت مقبول ہوگی اور آخرت میں اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہجرت اور نصرتِ رسولؐ (و دین) کا اجر ملے گا۔ اور دُنیوی غرض سے ہجرت کرنے والے کی ہجرت اسی کے حق میں لکھی جائے گی جس کے لیے اس نے ہجرت کا قصد کیا ہوگا۔ مطلب یہ کہ قیامت والے دن اسے اللہ کے ہاں سے کوئی اجر نہیں ملے گا' بلکہ اسے کہا جائے گا کہ جس کی وجہ سے ہجرت کی تھی اسی کے پاس جا کر اجر بھی طلب کرو۔ رسول اللہ ﷺ نے رمضان کے دنوں کے روزے اور راتوں خصوصاً لیلۃ القدر کے قیام پر سابقہ گناہوں کی معافی کی خوشخبری سنائی ہے' لیکن اس کے ساتھ یہ بھی بیان کیا ہے کہ یہ اجر اُسے ملے گا جو ایمان اور احتساب کا مظاہرہ کرے گا۔ 'احتساب' کا معنی یہ ہے کہ انسان یہ کام صرف اللہ ہی سے اجر پانے کے لیے کرے اور اس کے علاوہ کوئی اور مقصد اس کے پیشِ نظر نہ ہو۔

## اخلاصِ نیت ایک مشکل عمل

یہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ اخلاصِ نیت ایک مشکل اور محنت طلب عمل ہے۔ اسی لیے



حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جتنی مشقت اصلاحِ نیت پر کرنا پڑتی ہے اتنی کسی برائی پر نہیں کرنا پڑتی' کیونکہ نیت بار بار بگڑ جاتی ہے''۔ یوسف بن اسباط رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اللہ کی عبادت کرنے والوں کے لیے نیت کی اصلاح' عبادت میں طویل محنت سے زیادہ مشکل ہے۔'' (ایضاً) امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ نیت کیسے درست ہو سکتی ہے؟ جواب دیا: ''نفس کے ساتھ مسلسل جنگ کے ذریعے'' (ایمان کا سبق)۔ سہل تستریؒ کہتے ہیں: ''نفس پر اخلاص سے بڑھ کر کوئی چیز شاق نہیں ہوتی' اس کی وجہ یہ ہے کہ نفس کا اخلاص میں کوئی حصہ ہوتا ہی نہیں۔'' (جامع العلوم و الحکم لابن رجبؒ)

کسی نے اصلاحِ نیت کا بہت آسان علاج یہ بتایا ہے کہ 'ریا' سے بچا جائے۔ اس لیے کہ اشیاء اپنی اَضداد سے پہچانی ہی نہیں' بلکہ اصلاح پذیر بھی ہوتی ہیں' لہٰذا اخلاص کی پہچان کے لیے ریا کو سمجھنا اور اخلاص کے حصول کے لیے ریا سے بچنا بہت ضروری ہے۔

## ریا اور سُمعہ کا معنی و مفہوم

'اخلاص' کا نقیض اور متضاد رویہ 'ریا' ہے۔ لفظی طور پر ریا کا مطلب 'دکھلاوا' ہے۔ یہ دکھلاوا دینی امور میں بھی ہو سکتا ہے اور دُنیوی اُمور میں بھی' البتہ اصطلاحاً لفظ ریا دینی امور کے دکھلاوے کے لیے مخصوص ہو چکا ہے۔ اصطلاحی طور پر اپنی عبادت کے اظہار سے لوگوں کے نزدیک قدر و منزلت' تعریف و توصیف یا کوئی اور دُنیوی فائدہ حاصل کرنا 'ریا' کہلاتا ہے۔

دکھلاوے کے مفہوم کے لیے حدیث شریف میں 'ریا' کے ساتھ 'سُمعہ' کی اصطلاح بھی مذکور ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو ریا کرے گا اللہ اسے دکھا دے گا اور جو سُمعہ کرے اللہ اسے سنوا دے گا۔'' (صحیح البخاری) سمعہ کا ایک مطلب ''سنانا'' کیا گیا ہے۔ اس صورت میں یہ قولی عبادات مثلاً تلاوت اور درس و تدریس وغیرہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس کا ایک مطلب شہرت پسندی بھی کیا گیا ہے' یعنی اپنے نیک اعمال کی خبر لوگوں تک پہنچانا۔ ان دونوں میں سے کوئی سا بھی معنی مراد لینا صحیح ہے لیکن دوسرے مفہوم میں جامعیت پائی جاتی ہے۔

## دُنیوی اُمور میں دکھلاوا

بعض اوقات انسان دُنیوی اُمور میں دکھاوا کرتا ہے' مثلاً اپنے لباس' نظافت و جمال کے ذریعے خود نمائی کرنا وغیرہ۔ اس کے جائز یا ناجائز ہونے کا انحصار اس نیت و قصد پر ہے جس کی وجہ سے اس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں: ''دُنیوی امور میں دکھاوا

کبھی محض جائز ہوتا ہے‘ کبھی مستحب (یعنی باعثِ ثواب) اور کبھی مذموم و ممنوع (یعنی باعث گناہ) ہوتا ہے۔'' (احیاءعلوم الدین)

مباح قسم یہ ہے کہ انسان اپنی فطری ضرورت و جذبے کے تحت آرائش اختیار کرے اور ایسا کرتے وقت اس کی نیت سنت کی پیروی وغیرہ نہ ہو۔ مستحب زیب و آرائش یہ ہے کہ انسان کسی دینی ضرورت یا سنتِ رسول ﷺ کی پیروی کے جذبے سے زینت اختیار کرے۔ اظہارِ جمال کی ممنوع قسم یہ ہے کہ انسان اس میں مبالغہ کرتے ہوئے فخر اور اترانے کی حد تک چلا جائے۔ پھر انسان اسی نمود و نمائش ہی کو حق و باطل کا معیار بنا لیتا ہے۔ قرآن حکیم میں کافروں کا یہ طرزِ عمل بایں الفاظ بیان کیا گیا ہے:

﴿وَاِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا ۙ اَیُّ الۡفَرِیۡقَیۡنِ خَیۡرٌ مَّقَامًا وَّاَحۡسَنُ نَدِیًّا ﴿۷۳﴾ وَکَمۡ اَهۡلَکۡنَا قَبۡلَهُمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ هُمۡ اَحۡسَنُ اَثَاثًا وَّرِءۡیًا ﴿۷۴﴾﴾ (مریم)

''اور جب انہیں ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو کافر اہلِ ایمان سے کہتے ہیں کہ (ہم) دونوں گروہوں میں سے کون سا گروہ بہتر ہے اپنے مقام اور مجلس کے اعتبار سے؟ حالانکہ ہم ان سے پہلے کتنی ہی قومیں ہلاک کر چکے ہیں جو اسباب اور نمود و نمائش میں ان سے بہتر تھے۔''

مشرکینِ مکہ نے بھی نبی اکرم ﷺ کے خلاف یہی طرزِ عمل اختیار کیا جس کا نمایاں مظہر ان کا غزوۂ بدر کی طرف خروج تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت اور مسلمانوں کو اس طرزِ عمل سے روکتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿وَلَا تَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ خَرَجُوۡا مِنۡ دِیَارِهِمۡ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَیَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا یَعۡمَلُوۡنَ مُحِیۡطٌ ﴿۴۷﴾﴾ (الانفال)

''اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اپنے گھروں سے اتراتے‘ لوگوں کو دکھاتے اور اللہ کے راستے سے روکتے ہوئے نکلے۔''

## دینی امور میں دکھاوا

لفظ ریا سے اصطلاحاً یہی دکھاوا مراد ہوتا ہے اور آگے مضمون میں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوگا۔ اس کی ہر ایک قسم بالاتفاق حرام ہے۔ یہ وہ اظہارِ دینداری ہے جو غیر اللہ کے



لیے کی جاتی ہے۔ دکھاوے کی سینکڑوں شکلیں ہو سکتی ہیں۔ امام غزالیؒ نے بعض کا ذکر احیاء العلوم میں کیا ہے۔ ان میں سے چند ایک بطور مثال پیش کی جاتی ہیں۔ کوئی آدمی اپنے جسم کی کمزوری یا اپنی زرد رنگت کے اظہار سے یہ ظاہر کرے کہ خوفِ خدا کے سبب اس کی یہ حالت ہے‘ یا روزہ رکھ کر انسان نڈھال نظر آئے‘ تہجد و شب بیداری کو دن کے اوقات میں کسل مندی اور جمائی لینے کے ذریعے ظاہر کرے‘ اسی طرح ماتھے پر سجدے کے نشان کو جان بوجھ کر ظاہر کرنا‘ نیز اپنی چال ڈھال اور جھوٹا موٹا کھانے پہننے سے اپنے زُہد کا اظہار کرنا‘ اہل علم میں شمار ہونے کی غرض سے انہی جیسا لباس پہننا یا نصیحتیں کرنا‘ نماز و ذکر و اذکار کے اہتمام کو باتکلف ظاہر کرنا‘ خشوع وخضوع کا اظہار کرنا‘ اور لمبے سجدے و رکوع کرنا‘ اہل علم کے ساتھ اپنے تعلقات کا چرچا کرنا‘ اپنی علمیت کا اظہار کرنا‘ مثلاً بڑی بڑی کتابوں کے نام یا حوالے اپنی تحریر و تقریر میں نقل کرنا تاکہ علم دوستی کا رعب پڑے‘ وغیرہ۔ یہ سب دینی امور میں دکھلاوا کی مثالیں ہیں۔ اس ضمن میں یہ واضح رہنا چاہیے کہ مندرجہ بالا امور میں سے کئی ایک اپنی اصل کے اعتبار سے جائز ہیں‘ البتہ یہ مذموم تب ہوں گے جب اپنی دینداری کے اظہار کی نیت سے بجالائے جائیں۔

ریا کی پہلی صورت: دکھاوے کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اس کی سب سے مکروہ صورت یہ ہے کہ ابتدائے عمل ہی سے نیت دکھلاوے کی ہو۔ اس عمل کے باطل اور رائیگاں جانے میں کوئی شبہ نہیں۔

ریا کی دوسری صورت: ایک صورت یہ ہے کہ انسان کوئی عمل پورے خلوص سے شروع کرے لیکن دورانِ عمل انسان کے اندر دکھاوا پیدا ہو۔ پھر انسان اس کی طرف سے مطمئن ہو جائے اور اس پر خوشی و راحت محسوس کرے اور اسے دور کرنے کی کوشش نہ کرے۔ اس طرح اس عمل کے اندر ریا کی آمیزش ہو جائے تو ایک رائے کے مطابق یہ عمل بھی باطل اور اکارت چلا جائے گا۔ بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ ابتدائی حصہ جو بغیر ریا کے ادا ہو چکا اس کا ثواب ملے گا اور آخری حصے کا ثواب نہ ملے گا۔ امام غزالیؒ نے اسی کو ترجیح دی ہے جبکہ ابن رجب حنبلیؒ نے اس رائے کو متاخرین کی رائے قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ متقدمین کی اکثریت کی رائے یہی ہے کہ ایسا عمل پورے کا پورا باطل ہو جائے گا۔ یہی رائے وزنی نظر آتی ہے (واللہ اعلم بالصواب)۔

ریا کی تیسری صورت: ایک صورت یہ ہے کہ انسان نے کوئی عمل شروع کیا‘ پھر دورانِ عمل انسان میں دکھاوے کے جذبے نے سر اٹھایا‘ لیکن انسان نے شعوری طور پر اسے جھٹکنے کی کوشش

کی اور اس سے لذت وحظ نہیں اٹھایا تو یہ ریاکاری میں نہیں آئے گا‘ بلکہ اسے یوں سمجھنا چاہیے کہ شیطان ونفس کی طرف سے ایک حملہ ہوا تھا جسے اللہ کی مدد کے ساتھ پسپا کر دیا گیا۔ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ اللہ نے میری وجہ سے میری امت کے وہ وسوسے معاف کر دیے جو ان کے نفس ڈالتے رہتے ہیں جب تک وہ ان وسوسوں کے مطابق کوئی قول یا فعل انجام نہ دیں۔ (صحیح بخاری)

## ریا ایمان کی نفی ہے

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے صاف انداز میں ریاکاروں کے ایمان کی نفی کی ہے۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ط وَمَنْ یَّکُنِ الشَّیْطٰنُ لَہٗ قَرِیْنًا فَسَآءَ قَرِیْنًا ﴿۳۸﴾﴾ (النساء)

’’اور وہ لوگ جو اپنے مال خرچ کرتے ہیں لوگوں کو دکھانے کے لیے اور درحقیقت وہ نہ تو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ ہی یوم آخرت پر‘ اور جس کا ساتھی شیطان بن جائے تو وہ بہت برا ساتھی ہے۔‘‘

سورۃ البقرۃ میں فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِکُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی لا کَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَہٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ط﴾ (آیت ۲۶۴)

’’اے اہلِ ایمان! اپنے صدقات کو باطل نہ کر لو احسان جتلا کر اور کوئی اذیت بخش بات کہہ کر اس شخص کی طرح جو اپنا مال خرچ کرتا ہے لوگوں کو دکھانے کے لیے اور وہ نہ تو ایمان رکھتا ہے اللہ پر اور نہ ہی یوم آخرت پر۔‘‘

اس حوالے سے یہ ذہن نشین رہنا چاہیے کہ یہ ایمانِ حقیقی کی نفی ہے نہ کہ قانونی ایمان کی۔ یعنی ریاکاری کرنے والا ایمانِ حقیقی سے تو محروم ہو جاتا ہے لیکن قانونی طور پر وہ مسلمان ہی سمجھا جائے گا۔ ایمان باللہ کی نفی کی حکمت یہ ہے کہ ریاکار کے سامنے نہ تو اللہ کی عظمت اور اس پر یقین ہوتا ہے اور نہ ہی وہ نیک عمل اللہ کی رضا یا اس سے بدلہ پانے کی نیت سے کرتا ہے۔ اسی طرح ریاکار آخرت کی زندگی پر یقین اور اس کی عظمت کی واقفیت سے محروم ہوتا ہے‘ جس کی وجہ سے وہ اپنے اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں لے لینا چاہتا ہے اور اُخروی اجر وثواب اس کے پیش نظر نہیں ہوتے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ کے ہاں وہی عمل‘ عمل صالح کہلانے کا مستحق ہے



جو اللہ کی رضا کے حصول اور آخرت کے بدلے کی امید پر کیا جائے۔ بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ نے ’’مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب‘‘ کے دوسرے درس بعنوان: ’’نیکی کی حقیقت: آیت البر کی روشنی میں‘‘ میں اس بات پر بہت نفیس بحث کی ہے کہ نیکی کیا ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ نیکی کی روح یہ ہے کہ وہ اللہ کی رضا اور آخرت کی فلاح کے لیے کی جائے اور ان دو چیزوں کے بغیر کسی بھی عمل کو نیکی نہیں قرار دیا جا سکتا۔

## ریا شرکِ اصغر ہے

اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کا مقصد عبادت قرار دیا ہے۔ عبادت کی روح اخلاص ہے۔ یعنی انسان جو نیک اعمال کرے ان کی بنیاد اللہ کی رضا کا حصول ہی ہو اور ان سے اللہ ہی کی خوشنودی مطلوب ہو۔ پس جو شخص نیک اعمال یا عبادات کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور ہستی کی رضا یا انعام کا متلاشی ہے وہ اصل میں اللہ کی عبادت میں دوسروں کو شریک کر رہا ہے۔ اس حوالے سے چند ایک احادیث ملاحظہ ہوں:

(۱) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اَخْوَفَ مَا اَخَافُ عَلَیْکُمُ الشِّرْکُ الْاَصْغَرُ)) قَالُوْا وَمَا الشِّرْکُ الْاَصْغَرُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ؟ قَالَ: ((الرِّیَاءُ)) (مسند احمد)

’’مجھے تمہارے بارے میں کسی چیز کا اتنا اندیشہ نہیں ہے جتنا شرکِ اصغر کا ہے‘‘۔ پوچھا گیا: یارسول اللہ! شرکِ اصغر کیا ہے؟ فرمایا: ’’ریا‘‘

(۲) نبی مکرم ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ صَلّٰی یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ‘ وَمَنْ صَامَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ ، وَمَنْ تَصَدَّقَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ)) (مسند احمد)

’’جس نے دکھاوے کے لیے نماز پڑھی اُس نے شرک کیا‘ جس نے دکھاوے کے لیے روزہ رکھا اُس نے شرک کیا‘ اور جس نے دکھاوے کے لیے لوگوں کو صدقہ وخیرات دیا اُس نے شرک کیا۔‘‘

(۳) ایک بار نبی اکرم ﷺ نے اپنی اُمت کے مبتلائے شرک ہونے کا خدشہ ظاہر کیا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اظہارِ تعجب کیا۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ’’وہ لوگ نہ تو بتوں کی پوجا کریں گے اور نہ ہی کسی پتھر یا چاند اور سورج کی عبادت کریں گے‘ بلکہ اپنے اعمال میں

ریاکاری کریں گے۔'' (مستدرک حاکم)

ریاکاری کی تباہ کاری کا اندازہ اس حساسیت سے کیا جاسکتا ہے جو صحابہ کرام ؓ اس کے بارے میں روا رکھتے تھے۔ سیدنا عمرؓ ایک بار نبی اکرم ﷺ کی قبر کے پاس سے گزرے تو دیکھا کہ سیدنا معاذ بن جبلؓ وہاں بیٹھے رو رہے ہیں۔ پوچھنے پر بتایا کہ مجھے نبی اکرم ﷺ کی ایک بات یاد آ رہی تھی جو مجھے رلا رہی ہے اور وہ یہ کہ ((اِنَّ یَسِیْرَ الرِّیَاءِ شِرْکٌ)) ''یقیناً تھوڑی سی ریا بھی شرک ہے۔'' (سنن ابن ماجہ)

## ریاکاری ایک قسم کی منافقت ہے

ریاکاری عملی نفاق کی ایک قسم ہے۔ قرآن حکیم میں منافقین کی ایک خاص نشانی ریا بیان ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿یُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۱۴۲﴾﴾ (النساء) ''وہ (اپنی نماز) لوگوں کو دکھاتے ہیں اور اللہ کو یاد نہیں کرتے مگر بہت تھوڑا۔''

ریا اور نفاق کا قرب اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی ایک دعا میں ان دونوں کا ساتھ ساتھ ذکر فرمایا: ((اَللّٰھُمَّ طَھِّرْ قَلْبِیْ مِنَ النِّفَاقِ وَعَمَلِیْ مِنَ الرِّیَاءِ)) (مشکاۃ المصابیح) ''اے اللہ! میرے دل کو نفاق سے اور میرے عمل کو ریا سے پاک فرما۔''

اس بارے میں یاد رہنا چاہیے کہ ریاکاری اور دکھاوا اگر عقیدے کی سطح پر ہو یعنی ایک انسان اسلام کا اقرار کرتا ہو لیکن اس کے دل میں اس کا انکار ہو تو یہ قانونی یا اعتقادی نفاق ہے۔ لیکن اگر اقرار اسلام تو خلوص کے ساتھ ہو لیکن اعمال میں ریاکاری ہو تو یہ نفاقِ عملی ہے۔

## ریاکاری دجال سے زیادہ خوفناک ہے

نبی اکرم ﷺ نے ریا کو اہلِ ایمان کے لیے دجال سے بھی زیادہ خطرناک قرار دیا ہے۔ ایک دن صحابہ کرامؓ دجال کے بارے میں باتیں کر رہے تھے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا میں تمہیں وہ چیز نہ بتا دوں جو میرے نزدیک تمہارے حق میں مسیح دجال سے زیادہ خطرناک ہے؟'' صحابہ نے عرض کیا: ضرور بتایئے! فرمایا:

((اَلشِّرْکُ الْخَفِیُّ اَنْ یَقُوْمَ الرَّجُلُ یُصَلِّیْ فَیُزَیِّنُ صَلَاتَہٗ لِمَا یَرٰی مِنْ نَظَرِ رَجُلٍ)) (سنن ابن ماجہ)

''وہ شرکِ خفی ہے' اور وہ یہ ہے کہ انسان لوگوں کو دیکھ کر اپنی نماز کو زینت دے۔''



دکھاوے کو دجال کے مقابلے میں زیادہ خطرناک اس اعتبار سے کہا گیا کہ دجال کا ظہور ایک خاص وقت میں ہو گا جب کہ ریا کا فتنہ ہر وقت ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ (مرقاۃ)

## ریاکارانہ اعمال ناقابلِ قبول ہیں

ریاکارانہ اعمال اللہ کے ہاں باطل اور جھوٹے قرار پائیں گے۔ ارشادِ باری ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِکُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی ۙ کَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَہٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ﴾ (البقرۃ: ۲۶۴)

''اے اہل ایمان اپنے صدقات باطل مت کرو احسان جتلا کر اور تکلیف پہنچا کر اس شخص کی طرح جو اپنا مال خرچ کرتا ہے لوگوں کو دکھانے کے لیے۔''

اللہ تعالیٰ نے ریاکاری کے انفاق کی مثال دیتے ہوئے فرمایا:

﴿فَمَثَلُہٗ کَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْہِ تُرَابٌ فَاَصَابَہٗ وَابِلٌ فَتَرَکَہٗ صَلْدًا ؕ لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ مِّمَّا کَسَبُوْا ؕ وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْکٰفِرِیْنَ ﴿۲۶۴﴾﴾ (البقرۃ)

''پس ایسے انفاق کی مثال ایک چٹان کی طرح ہے جس پر مٹی ہو اور زور کی بارش آئے تو اسے بالکل ہی صاف کر دے۔ اسی طرح ریاکار بھی اپنی کمائی پر کچھ قدرت نہیں رکھتے۔ اور اللہ ایسے کافروں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰہَ لَا یَقْبَلُ مِنَ الْعَمَلِ اِلَّا مَا کَانَ لَہٗ خَالِصًا وَابْتُغِیَ بِہٖ وَجْھُہٗ)) (النسائی)

''بے شک اللہ تعالیٰ صرف وہی عمل قبول فرماتا ہے جو اسی کے لیے خالص ہو اور اس عمل سے اللہ کی رضامندی چاہی جائے۔''

حدیث قدسی کے مطابق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''میں اپنے شریکوں کے شرک سے غنی ہوں' اور جو شخص کوئی ایسا عمل کرے جس میں وہ میرے ساتھ کسی اور کو بھی شریک کرے تو میں اسے (یعنی اس شخص) کو بھی چھوڑ دوں گا اور اس کے شرک (کردہ عمل) کو بھی۔'' (صحیح مسلم)

## ریاکاری باعث رسوائی ہے

ریاکاروں کے لیے اللہ تعالیٰ نے رسوائی کی سزا بھی تیار کر رکھی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''جو لوگوں کو سنانے کے لیے نیک کام کرے گا اللہ اسے سنوا دے گا اور جو لوگوں کو دکھانے کے لیے نیک کام کرے گا اللہ اسے دکھا دے گا۔'' (متفق علیہ)

اس حوالے سے ایک رائے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سنوانے کا معاملہ دنیا میں ہی پیش آئے گا۔ ایک تو اس طرح کہ اللہ تعالیٰ اس کی شہرت پسندی کی خواہش کو پورا ہونے دے گا اور اس کی شہرت لوگوں تک پھیل جائے گی۔ اس کے نتیجے میں وہ ریا کاری کے میدان میں مزید آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ یہ اصل میں اس کے لیے اللہ کی طرف سے ڈھیل اور استہزا ہوگا۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ دنیا ہی میں اس کا ریا کار ہونا ظاہر کر دے گا۔ اس کے نتیجے میں لوگ اس پر ہنسیں گے اور اسے دھوکے باز اور گھٹیا کردار کا مالک جان لیں گے۔ یہ دونوں مفہوم اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہیں۔ جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''جو لوگوں کو اپنے اعمال سنوائے گا تو اللہ اپنی مخلوق کو یہ سنوا دے گا اور اسے لوگوں کے سامنے چھوٹا اور حقیر کر کے دکھائے گا۔'' (مسند احمد)

سنانے کا ایک مطلب یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ بروزِ قیامت اسے ذلیل کیا جائے گا۔ امام ابن حجرؒ نے اسی کو ترجیح دیتے ہوئے نبی اکرم ﷺ کے دو فرمان نقل کیے ہیں:

(۱) ''جو دنیا میں شہرت پسندی اور ریا کاری کے مقام پر کھڑا ہوا کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی اصلیت لوگوں کو دکھا اور سنا دے گا۔'' (مسند احمد)

(۲) ''جو بندہ بھی دنیا میں ریا اور سمعہ کے مقام پر کھڑا ہوگا تو اللہ تعالیٰ قیامت والے دن تمام مخلوق کے سامنے اسے سنوا دے گا۔'' (المعجم الکبیر)

قیامت کے دن اس رسوائی کا ظہور حدیث شریف میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمام لوگوں کو جمع کرلے گا تو ایک منادی صدا لگائے گا کہ جس نے اللہ کے لیے کیے جانے والے کسی کام میں کسی دوسرے کو شریک کیا ہو تو وہ اسی سے جا کر اپنا اجر طلب کرے' کیونکہ اللہ تعالیٰ تمام شریکوں کے شرک سے غنی ہے۔ (سنن ترمذی)

ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((يَقُوْلُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ : لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِذَا جُزِيَ النَّاسُ بِاَعْمَالِهِمْ اذْهَبُوْا اِلَى الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُرَآءُوْنَ فِي الدُّنْيَا فَانْظُرُوْا هَلْ تَجِدُوْنَ عِنْدَهُمْ جَزَاءً)) (مسند احمد)

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: قیامت کے دن جب لوگوں کو ان کے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا تو ریا کاروں سے کہا جائے گا: جاؤ ان کے پاس جا کر اپنا بدلہ طلب کرو جن کو دکھانے کے لیے تم عمل کرتے تھے۔''

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ریا کاروں کو مختلف بُرے ناموں سے پکارا جائے



گا۔ اسی لیے امام ذہبیؒ اس کا امکان ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قیامت والے دن دکھلاوا کرنے والوں کو 'ریا کار' فاجر، خاسر اور غادر (غدار' دھوکے باز) کے ناموں سے پکارا جائے گا۔'' (الکبائر)

## ریا کارانہ نیکی کرنے والوں کا انجام

چونکہ ریا کاری شرک اور حرام کام ہے لہٰذا اس میں مبتلا ہونے کی صورت میں انسان دوزخ کی سزا کا مستحق ہو جاتا ہے۔ صحیح مسلم میں ایک عنوان یوں باندھا گیا ہے: ''جو ریا اور سُمعہ کے لیے قتال کرے مستحق دوزخ ہے''۔ اس کے بعد یہ طویل حدیث نقل کی گئی ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے ایک شہید کو لایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنی نعمتیں جتلا کر پوچھے گا کہ تم نے میرے لیے کیا کیا؟ وہ کہے گا: میں نے تیرے راستے میں جنگ کی اور شہید ہو گیا۔ اللہ کہے گا: تو نے جھوٹ بولا۔ تو اس لیے لڑتا تھا کہ لوگ کہیں بہت بہادر ہے' سو وہ کہا جا چکا۔ فرشتوں کو حکم ہوگا کہ اسے دوزخ میں ڈال دو۔ پھر ایک عالم کو لایا جائے گا اور اس سے پوچھا جائے گا کہ ہم نے تجھے علم دیا' تو نے میرے لیے کیا کیا؟ وہ کہے گا: اے اللہ! میں نے تیرے لیے لوگوں کو قرآن سکھایا۔ کہا جائے گا: تو نے جھوٹ کہا' تو تو اس لیے پڑھاتا تھا کہ تجھے عالم کہا جائے' پس وہ کہا جا چکا۔ پھر اس کے بارے میں بھی دوزخ کا حکم صادر ہوگا۔ آخر میں ایک سخی کو لایا جائے گا اور اس سے پوچھا جائے گا کہ ہم نے تجھے دولت دی تھی' تو نے کیا کیا؟ وہ کہے گا: اے اللہ! میں نے اسے شب و روز تیرے راستے میں خرچ کیا۔ کہا جائے گا: نہیں بلکہ تو تو اس لیے خرچ کرتا تھا تاکہ تجھے سخی کہا جائے' سو وہ کہا جا چکا۔ پھر اس کے بارے میں بھی دوزخ کی سزا سنا دی جائے گی۔

## ریا کا ایک شعبہ ارادۂ دنیا

ارادۂ دنیا یعنی دنیا ہی کو مطلوب و مقصود بنا لینے کا مطلب یہ ہے کہ انسان جو بھی نیک کام کرے دنیا ہی کے فائدے کے لیے کرے' یہ اخلاص کے منافی رویہ ہے۔ ڈاکٹر سعید بن علی قحطانی لکھتے ہیں:

''ارادۂ دنیا یعنی نیک اعمال کو دنیا ہی کے مفاد کے لیے کرنا ریا سے بھی زیادہ خطرناک ہے' کیونکہ دنیا کے مرید پر تو دنیا طلبی کا جذبہ اکثر و بیشتر غالب رہتا ہے جبکہ اس کے برعکس ریا (دکھاوا) ہر وقت نہیں ہوتی۔ ہوسکتا ہے کہ کئی اعمال میں ریا کاری ہو لیکن چند

عمل اس سے محفوظ بھی رہ جائیں۔ پس ارادۂ دنیا انسان کے اعمال کو ضائع کرنے والا ہے اور اس سے حد درجہ محتاط رہنا چاہیے۔'' (نور الإخلاص وظلمات إرادة الدنيا بعمل الآخرة)

ریا کا مطلب ہے کہ انسان اپنے عمل سے لوگوں کے سامنے اچھا نظر آنے کی خواہش کرے تاکہ لوگ اسے نیک سمجھیں اور اس کی تعظیم و تعریف کریں۔ پس اس ریا کے اندر دنیا کی چاہت بھی شامل ہے‘ کیونکہ ان اعمال سے مطلوب مذکورہ تمام فوائد دنیا ہی سے متعلق ہیں۔ ارادۂ دنیا یہ ہے کہ انسان نیک کام کرے تو اس سے مقصود لوگوں کو دکھانا یا نیک دِکھنا نہ ہو بلکہ اس نیکی سے دنیا کا کوئی فائدہ مطلوب ہو‘ مثلاً کوئی مجاہد مالِ غنیمت کے لیے جہاد کرے تو اس صورت میں اصل مطلوب دنیا ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دُنیا ہی کے لیے نیک اعمال کرنے کی متعدد بار مذمت فرمائی ہے۔ ارشاد باری ہے:

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۝١٥ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝١٦﴾ (ھود)

''جو لوگ دُنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت ہی کا ارادہ کرلیں تو ہم ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ انہیں اس دنیا ہی میں دے دیں گے اور اس میں ان کا نقصان نہ کیا جائے گا۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں سوائے آگ کے اور کچھ نہیں ہے‘ اور جو کام اور اعمال وہ دنیا میں کرتے تھے وہ باطل و اکارت چلے جائیں گے۔''

طالب دنیا کے نیک اعمال کا بدلہ اسے دنیا ہی میں اس کے مطلوب و مقصود فائدے کی صورت میں دے دیا جائے گا اور آخرت میں اسے کوئی اجر و ثواب نہ ملے گا۔ ارشاداتِ ربانی ملاحظہ فرمائیے: ﴿فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝٢٠٠﴾ (البقرۃ) ''پس لوگوں میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں: اے رب! ہمیں دنیا ہی میں دے دے اور ان کے لیے آخرت میں کچھ حصہ نہ ہوگا۔ سورۃ الشوریٰ میں فرمایا: ﴿وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ۝٢٠﴾ ''اور جو دنیا کی کھیتی کا طالب ہوگا اسے ہم اس میں سے دے دیں گے اور آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہ ہوگا۔'' مبین قرآن ﷺ نے اس حقیقت کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا: ((فَمَنْ عَمِلَ مِنْهُمْ عَمَلَ الْاٰخِرَةِ لِلدُّنْيَا لَمْ يَكُنْ لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ نَصِيْبٌ)) (مسند احمد) ''پس جس نے



آخرت میں کام آنے والا کوئی عمل دنیا کے لیے کیا تو آخرت میں اسے کوئی حصہ نہیں ملے گا۔''

ارادۂ دنیا کی واشگاف مذمت سورۂ بنی اسرائیل میں وارد ہوئی ہے‘ وہاں فرمایا گیا:

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝١٨﴾

''جو کوئی چاہتا ہو جلدی مل جانے والی ہی کو تو ہم اس کو اسی دنیا میں دے دیتے ہیں‘ جتنا چاہیں‘ جس کو چاہیں‘ پھر ہم نے اس کے لیے دوزخ (کو بطور ٹھکانہ) بنا رکھا ہے‘ جس میں اسے داخل ہونا پڑے گا مذمت زدہ ہوتے ہوئے دھکے کھا کر۔''

اس آیت پر غور کرنے سے تین باتیں معلوم ہوتی ہیں:

(۱) مرید دنیا کو اپنی چاہت کے مطابق دنیا بھی نہیں ملتی بلکہ اللہ تعالیٰ کی اسی ازلی تقسیم کے مطابق ملتی ہے جو اللہ نے اس کے دنیا میں آنے سے پہلے مقدر کر رکھی تھی۔ حیف کہ انسان اپنی آخرت کو تج کر دنیا لینا چاہتا ہے لیکن ملتا پھر بھی وہی ہے جس کا پہلے ہی ملنا طے تھا۔

(۲) صد حیف کہ دنیا کا یہ حقیر فائدہ بھی ہر طالبِ دنیا کو نہیں بلکہ کسی کسی کو ملتا ہے۔ سچی بات ہے کہ انسان ان آیات پر غور کرے‘ اپنا جائزہ لے اور سر پکڑ کر سوچے تو کہہ اٹھے گا کہ دنیا طلبی تو دنیا و آخرت کے خسارے کا نام ہے۔

(۳) اس آیت سے تیسری تلخ حقیقت یہ معلوم ہوئی کہ ارادۂ دنیا کے جرم کی پاداش میں دوزخ کی سزا بھی بھگتنا پڑ سکتی ہے اور وہ بھی دھکے کھاتے ہوئے‘ مذمت یافتہ ہو کر۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ تَعَلَّمَ عِلْمًا مِمَّا يُبْتَغٰى بِهٖ وَجْهُ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ لَا يَتَعَلَّمُهٗ اِلَّا لِيُصِيْبَ بِهٖ عَرَضًا مِنَ الدُّنْيَا لَمْ يَجِدْ عَرْفَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَعْنِيْ رِيْحَهَا))

(سنن ابی داؤد)

''جو شخص وہ علم حاصل کرے جس سے اللہ کی رضا حاصل کی جاتی ہے (یعنی علم دین) اور اسے وہ سامانِ دنیا حاصل کرنے کے لیے حاصل کرے تو وہ قیامت کے دن جنت کی خوشبو تک نہ سونگھ سکے گا۔''

## ایک اشکال اور اس کا جواب

شریعت کے بعض فرائض ایسے ہیں جن کا نتیجہ بظاہر دنیا ہی میں مطلوب ہوتا ہے۔ مثلاً

جہاد و اقامتِ دین وغیرہ۔ اس پر یہ اشکال پیش آتا ہے کہ ان کاموں کے دنیوی نتیجے کی تمنا و ارادہ کرنا‘ ارادۂ دنیا کے زمرے میں تو نہیں آتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ ان کاموں کا نتیجہ اس دنیا میں نکلتا ہے اور اسے حاصل کرنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے لیکن اس کوشش سے مطلوب مجاہد کی اپنی سربلندی یا دُنیوی فائدہ نہیں ہوتا‘ بلکہ اس کے پیش نظر دین کی سربلندی ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ)) (متفق علیه)

’’جو اس لیے جہاد کرے کہ اللہ کا کلمہ سب سے بلند ہو جائے تو وہی مجاہد فی سبیل اللہ ہے۔‘‘

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں غلبۂ اسلام کی نیت سے جہاد کرنا دنیا طلبی نہیں بلکہ عین جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ پس جب تک جہاد کا محرک و مقصود اعلائے کلمۃ اللہ ہی رہے گا‘ یہ جِدّوجُہد دنیا طلبی نہیں بلکہ جہاد اور اس میں متحرک شخص مجاہد فی سبیل اللہ قرار پائے گا۔ البتہ اگر اس کے برعکس کوئی شخص یا گروہ جہاد کے اصل مقصود کو چھوڑ کر کسی اور مقصد کی خاطر جہاد شروع کر دے تو یہ مجاہد نہیں بلکہ دنیا کا طالب و جاہد ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ان تمام اشخاص کے مجاہد ہونے کی نفی فرمائی جو اپنی بہادری‘ قومی تعصب و حمیت یا مالِ غنیمت کے لیے لڑائی کریں۔

## دُنیوی فوائد کے لیے جہاد

اگر کوئی شخص دُنیوی فائدے کے لیے جہاد یا اقامتِ دین کی جدوجہد کرتا ہے تو اسے اجر و ثواب نہیں بلکہ وہی چیز ملے گی جس کی اس نے نیت کی تھی۔

ایک صحابی نے نبی اکرم ﷺ سے سوال کیا: ’’اے اللہ کے نبی ﷺ یہ بتایئے کہ ایک آدمی مزدوری یا شہرت کی خاطر لڑائی کرے تو اس کے لیے کیا ہے؟‘‘ آپ ﷺ نے جواب دیا:

((اِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبَلُ مِنَ الْعَمَلِ اِلَّا مَا كَانَ لَهٗ خَالِصًا وَابْتُغِيَ بِهٖ وَجْهُهٗ)) (سنن النسائی)

’’(اس کے لیے کوئی چیز نہیں ہے کیونکہ) اللہ تعالیٰ بلاشبہ صرف وہی عمل قبول فرماتا ہے جو خالص اسی کے لیے ہو اور اس کام سے اسی کی رضا چاہی جائے۔‘‘

ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ غَزَا وَهُوَ لَا يُرِيْدُ اِلَّا عِقَالًا فَلَهٗ مَا نَوٰى)) (سنن النسائی)

’’جس نے اللہ کے راستے میں لڑائی کی اور اس کی نیت اتنی ہی تھی کہ اسے اونٹ باندھنے والی رسی مل جائے تو اس کے لیے وہی کچھ ہے جس کی اس نے نیت کی ہوگی۔‘‘



اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقامتِ دین و جہاد میں دُنیوی منفعت پیش نظر نہیں رہنی چاہیے اور اگر ان امور سے مطلوب و مقصود دُنیوی فائدہ ہو تو پھر ان امور کا اجر و ثواب ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔

## ضمنی طور پر دنیوی فائدے کا حصول

جہاد اور اقامت دین میں غلبۂ دین کے ساتھ ساتھ مادی فوائد بہر حال موجود ہیں۔ مثلاً اقامتِ دین سے خوشحالی اور جہاد سے مالِ غنیمت حاصل ہوتا ہے۔ یا پھر اسلامی حکومت کی باقاعدہ فوج جہاد کرے گی تو ظاہر ہے فوجی مجاہدین کو تنخواہ بھی ملے گی‘ لیکن یہ تنخواہ لینا آخرت طلبی کے منافی نہیں ہے بشرطیکہ نیت اور مقصودِ اصلی اللہ کی رضا اور اخروی فلاح ہو۔ علامہ مناویؒ فیض القدیر میں لکھتے ہیں: ’’جہاد کا مقصودِ اصلی اور باعث حقیقی اللہ کے دین کی سربلندی ہونا چاہیے‘ لیکن اگر ضمنی طور پر دنیوی فائدہ حاصل ہو جائے تو یہ اخلاص کے منافی نہیں ہے۔‘‘ علامہ ابن حجرؒ لکھتے ہیں: ’’جمہور کی رائے یہی ہے کہ جب جہاد کا مقصودِ اوّل اللہ تعالیٰ کے کلمے کی سربلندی ہو تو ضمنی طور پر جو بھی فائدہ مل جائے اسے لینے میں کوئی حرج نہیں ہے‘‘۔ اسی ذیل میں وہ دینی کارکن بھی آ جاتے ہیں جو مختلف تبلیغی اور احیائی تحریکوں میں کچھ فرائض سرانجام دے رہے ہوں اور اس کا معاوضہ بھی وصول کر رہے ہوں تو ان کا یہ معاوضہ وصول کرنا دنیاداری نہیں ہے بشرطیکہ ان کا مقصودِ اصلی تنخواہ نہ ہو بلکہ مطلوب دین کی خدمت ہی ہو‘ البتہ بغیر کسی اُجرت کے کام کرنا افضل اور زیادہ اجر و ثواب کا باعث ہے۔

اسی طرح اقامتِ دین کی جدوجہد میں دنیا کا غلبہ اصل مطلوب نہیں ہونا چاہیے‘ بلکہ مقصودِ اصلی نجاتِ اُخروی اور رضائے رب ہی رہنا چاہیے اور اقامتِ دین کو مقصودِ اصلی کے حصول کا ایک ذریعہ سمجھنا چاہیے۔ سورۃ الصف میں اللہ تعالیٰ نے دنیوی فتح کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا:

﴿وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ۭ﴾ (آیت ۱۳)

’’اور ایک دوسری چیز جسے تم پسند کرتے ہو‘ اللہ کی طرف سے مدد اور نزدیک کی فتح۔‘‘

امام حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ اس اسلوب ﴿تُحِبُّوْنَهَا﴾ ’’تم پسند کرتے ہو‘‘ میں دُنیوی کامیابی کی محبت کی کسی قدر مذمت پائی جاتی ہے۔ (تفسیر کبیر)

## نیک لوگ اور ریا

امام غزالیؒ لکھتے ہیں:

’’ریا اور دکھلاوے کا خطرہ نیک لوگوں کو زیادہ ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے جب وہ اپنے نفس کے خلاف جہاد کر کے اسے مغلوب کرتے ہوئے‘ کھلے گناہوں اور شہوات ولذات سے خود کو بچاتے اور عبادت میں لگاتے ہیں تو نتیجے میں عوام الناس تعظیم وتوقیر کا سلوک کرتے ہیں تو ان کے نفس اسی کی لذت سے تسکین پاتے ہیں۔ اس طرح انسان رفتہ رفتہ اپنی نیکی وتقویٰ کے اظہار کی طرف راغب ہوتا جاتا ہے اور اس کے لیے ریا کا دروازہ کھل جاتا ہے‘‘۔(احیاء العلوم)

اس لیے جن لوگوں کو اللہ نے نیکی کی توفیق دی ہے انہیں ریا سے حد درجہ محتاط رہنا چاہیے۔ یہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ حدیث میں ریا کاری کے مجرمین کی بیان کردہ اکثر مثالیں دینداروں ہی کی ہیں‘ جیسا کہ حدیث پاک میں مجاہد‘ عالم‘ خطیب‘ سخی کی مثالیں آئی ہیں۔ اسی طرح ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’جُبِّ حُزن سے اللہ کی پناہ مانگا کرو‘‘۔ صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! جُبِّ حُزن (دکھ کا گڑھا) کیا ہے؟ آپ ﷺ نے جواب دیا:

**((وَادٍ فِیْ جَهَنَّمَ تَتَعَوَّذُ مِنْهُ جَهَنَّمُ كُلَّ يَوْمٍ مِائَةَ مَرَّةٍ)) قُلْنَا: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَنْ يَدْخُلُهٗ؟ قَالَ: ((اَلْقُرَّاءُ الْمُرَاؤُوْنَ بِاَعْمَالِهِمْ))** (سنن الترمذی)

’’یہ جہنم کی ایک وادی کا نام ہے جس سے خود جہنم بھی دن میں سو بار پناہ مانگتی ہے‘‘۔

صحابہ نے عرض کیا: ’’اے اللہ کے رسول ﷺ! اس میں کون لوگ داخل ہوں گے؟

آپ ﷺ نے فرمایا: ’’اپنے اعمال سے ریا کاری کرنے والے اہل علم لوگ‘‘۔

یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ نیکی کے اعلانیہ کیے جانے والے کاموں میں ریا کا امکان بھی زیادہ ہے۔ اس لیے ان لوگوں کو ریا کے مقابلے میں زیادہ ہوشیار رہنا چاہیے جو دعوت و ارشاد‘ تعلیم وتدریس‘ غلبہ واقامت دین اور جہاد فی سبیل اللہ کے میدانوں میں سرگرم ہیں۔ یہ وہ کام ہیں جنہیں نہ تو چھوڑنا ممکن ہے اور نہ ہی چھپا کر کرنا‘ بس اللہ کی مدد وتوفیق پر اعتماد کرتے ہوئے ریا سے بچنے کی امکان بھر کوشش کے ساتھ ان فرائض کو بجالاتے رہنا چاہیے۔

(جاری ہے)

❁❁❁

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا

# دنیا کا دھوکہ اور راہِ اعتدال

حافظ انجینئر عمیر انور☆

اللہ سبحانہ‘ وتعالیٰ نے انسان کو اِس دنیا میں بھیج کر جس آزمائش اور امتحان میں مبتلا فرمایا ہے‘ اِس میں کامیابی کا راستہ بھی ’’راہِ اعتدال‘‘ کی شکل میں واضح فرما کر اس کی رہنمائی کا بھرپور بندوبست فرمایا ہے۔ اِس آزمائش کی ایک گھمبیر شکل دنیا کے ساتھ انسان کے تعلق کا صحیح صحیح تعین ہے۔ اِس تعلق میں اِفراط وتفریط انسان کی ناکامی کا پیش خیمہ ہے جبکہ روشِ اعتدال کے ساتھ اِس کو برتنا کامیابی کی کلید ہے۔ لیکن اِس روشِ احسان پر عمل پیرا ہونا ہرگز کوئی آسان امر نہیں ہے۔ یہاں قدم قدم پر نفس اور شیطان کے حملوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ اسی طرح اپنی طرف کھینچنے والی بڑی مضبوط و مستحکم کشش دنیا اور معصیتوں کی ترغیبات بھی موجود ہیں جبکہ دوسری جانب انسانی جذبات کی بے اعتدالی اور ان میں پایا جانے والا شدت کی طرف میلان بھی صراطِ مستقیم سے ہٹانے کا باعث بنا کرتا ہے۔ اس چوکھی آزمائش میں کامیابی کے لیے اللہ سبحانہ‘ و تعالیٰ کی جانب سے عطا شدہ ہدایت پر غور وفکر اور اللہ کی توفیق سے اس پر عمل ہی واحد راستہ ہے۔

دنیا کے ساتھ تعلق میں اعتدال کی روش کو سمجھنے کے لیے افراط وتفریط کے چیدہ چیدہ راستوں کی نشان دہی ضروری ہے۔ جہاں تک افراط کا تعلق ہے تو قرآنِ حکیم نے قومِ بنی اسرائیل کے بحیثیتِ مجموعی تذکرے کے ساتھ ساتھ اِس کے چنیدہ قبائل وافراد کے طرزِ عمل کا ذکر فرما کر ہماری ہدایت وعبرت کے لیے سامانِ وافر کا اہتمام فرما دیا ہے۔ دنیا کے ساتھ حد سے بڑھا ہوا تعلق ہی شاید وہ بنیادی ’’مرض‘‘ ہے جس کی بدولت بنی اسرائیل احساناتِ الٰہی اور فضیلتوں کے اوجِ ثریا پر پہنچنے کے باوجود بھی ’’مَغضُوب عَلَیھِمْ‘‘ کی اتھاہ گہرائیوں اور عبرت ناک مقام تک پہنچ گئے۔ قرآن حکیم میں جابجا ان کی اِس کیفیت کا ذکر آیا ہے۔ اللہ سبحانہ‘ وتعالیٰ کے ساتھ عہد و پیمان کرکے اور مضبوطی سے میثاق باندھ کر بار بار ان کی

☆ ناظم دعوت‘ تنظیم اسلامی حلقہ کراچی جنوبی۔ UmairAnwar@QuranAcademy.com



خلاف ورزی کرنا‘ حیلے بہانے کر کے اُس کے احکامات کو توڑنا اور مذاق بنانا‘ اللہ سبحانہ‘ وتعالیٰ کی نعمتوں اور عنایات کی سخت ناشکری کرنا‘ اصلاحِ احوال کے لیے بلانے والے انبیاء کرامؑ کے قتل کے درپے ہو جانا اور کئی ایک کو قتل ہی کر ڈالنا اور اللہ سبحانہ‘ وتعالیٰ کی آیات کی ’’تکذیب عملی‘‘ کے مرتکب ہونا‘ وہ امور ہیں جن میں قومِ بنی اِسرائیل بحیثیت مجموعی مبتلا تھی۔

اللہ سبحانہ‘ وتعالیٰ نے اپنے خاص فضل وکرم سے اِنہیں فرعون اور قومِ فرعون کے ظلم وستم سے نجات عطا فرمائی۔ اِن کے ستر ہزار افراد نے بچھڑے کو معبود بنا لینے کے جس جرمِ عظیم کا ارتکاب کیا تھا‘ اسے معاف فرما کر ان کی جان بخشی فرمائی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے انھیں شریعت عطا فرمائی۔ پھر جب ان سے قتال کا مطالبہ کیا گیا تو انہوں نے ’’حُبِّ دُنیا‘‘ کی وجہ سے قتال سے گریز کیا اور صاف انکار کر دیا۔ اس کے بعد جب انہیں چالیس سال تک صحرائے سینا میں بھٹکتے رہنے کی سزا دی گئی تو اِس دوران بھی اللہ سبحانہ‘ وتعالیٰ نے اپنی عنایت سے ان پر بادل کا سایہ کیے رکھا۔ اِن کے پینے کے لیے پانی کے بارہ چشمے جاری کر دیے اور کھانے کے لیے مَن وسَلویٰ کا بندوبست فرما دیا...... لیکن ان کی ناشکری اور دنیا سے محبت کا مظہر یوں سامنے آیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سبزیوں‘ دالوں اور مختلف قسم کے کھانوں کا مطالبہ کرنے لگے۔

اِسی دنیا پرستی کی بدولت پھر ان کے دل سخت کر دیے گئے اور اِسی شقاوتِ قلبی کا ایک مظہر یہ بھی سامنے آیا کہ اس قوم کے افراد نے بالعموم اور علماء نے بالخصوص ’نہی عن المنکر‘ یعنی برائی سے روکنے کا فریضہ ترک کر دیا۔ دنیا پرستی اور لذاتِ نفس کے حصول کی خاطر اللہ کے دین سے بے وفائی کرتے ہوئے برائیاں کرنے والوں اور حرام میں ملوث لوگوں کے ساتھ کھانے پینے اور مجلسوں میں شریک ہونے سے باز نہ آتے۔ اس کے بعد خود بھی سراپا منکرات میں لَت پَت ہونا شروع ہوئے اور نوبت بایں جارسید کہ دنیا کے تھوڑے سے فائدے کے لیے کتابِ الٰہی میں تحریف تک کر دیا کرتے تھے۔ متاعِ دنیا کے حصول اور داد ودہش کی خواہش میں باحیثیت افراد کے لیے ان کی مرضی ومنشا کا خیال رکھتے ہوئے ان کے من پسند فتوے جاری کر دیا کرتے تھے اور اس کے لیے انہوں نے تورات کو بازیچۂ اَطفال بنا لیا تھا۔ اسی دنیا کی ہوس کی بدولت ایک دوسرے کا خون بہاتے تھے اور گھروں سے نکال دیتے تھے۔ سبت (یعنی ہفتے کا پورا دن عبادت کے لیے وقف کرنے اور کاروبارِ دنیا سے مکمل اجتناب) کا حکم دنیا کی محبت کی وجہ سے بہت بھاری ہونے لگا تھا۔ چنانچہ سورۃ الاعراف کے اکیسویں رکوع

میں بنی اسرائیل کی ایک بستی کا ذکر کیا گیا جس کے ایک گروہ نے حیلہ کر کے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے اس حکم کو توڑنا شروع کیا۔ اسی بستی کے دوسرے گروہ نے ان برائی کرنے والوں کے طرزِ عمل کی اصلاح کی کوشش کو اپنی ذمہ داری نہ سمجھا اور انہیں نظرانداز کیا۔ جبکہ آخری اور تیسرے گروہ نے اِس برائی سے مکمل اجتناب کرتے ہوئے اوّل الذکر دونوں گروہوں کی اصلاح کی کوشش کی۔ پہلے گروہ کو سمجھایا کہ وہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی سے باز آجائیں وگرنہ اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔ دوسرے گروہ کے سامنے یہ بات واضح کی کہ وہ نہی عن المنکر کے فریضے کو نظرانداز نہ کریں اور اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ ممکن ہے کہ پہلا گروہ اپنی اصلاح کرلے یا کم از کم کل کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے حضور کوئی معذرت ہی پیش کی جاسکے۔ اس ساری کشمکش میں بالآخر پہلے دونوں گروہوں پر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا غضب دنیا ہی میں نازل کردیا گیا اور صرف مؤخر الذکر کو سزا سے بچایا گیا۔

اسی سورت کے اگلے رکوع میں بطورِ عبرت قومِ بنی اسرائیل کے ایک فرد کی دنیا پرستی و نفس پرستی کا ذکر کیا گیا ہے جسے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اپنی عنایات سے نوازا تھا اور روحانی بلندی عطا کی تھی' لیکن وہ نفس پرستی کا شکار ہو کر ''زمین'' یعنی اپنی جبلی ونفسانی خواہشات کی بلا روک ٹوک تکمیل کی جانب مائل ہوگیا۔ دنیا پرستی کی وجہ بہت ہی برے انجام سے دوچار ہوا' جس کی تفصیلات احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں معلوم ومعروف ہیں اور اس مقام کی تفسیر میں اکثر مفسّرین نے اسے درج بھی فرمادیا ہے۔

پھر بنی اسرائیل ہی کے ایک فرد ''قارون'' کا ذکر بھی سورۃ القصص میں کیا گیا جو کہ دنیوی وسائل اور خزانوں کا مالک تھا' لیکن اپنی دنیا پرستی کی وجہ سے مال ودولت کو محض نام ونمود پر ہی خرچ کیا کرتا تھا۔ ان وسائل کو اپنی محنت ومنصوبہ بندی کا عوض سمجھا کرتا تھا اور اس کے بارے میں عنایتِ خداوندی کا اعتقاد نہ رکھتا تھا۔ پھر اس مال کو مستحقین پر خرچ کرنا اور آخرت کی تیاری کے لیے لگانا اور کھپانا سرے سے اس کے پیشِ نظر نہ تھا۔ اِسی طرزِ عمل کی پاداش میں اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے اسے اس کے خزانوں سمیت زمین میں دھنسا دیا۔ یہ چند مثالیں ہیں دنیا سے تعلق کے ضمن میں اس ''افراط'' کی جس کا شکار بنی اسرائیل بحیثیتِ مجموعی ہوگئے تھے۔

''تفریط'' کے حوالے سے قرآن حکیم میں نصاریٰ کے اس کردار کا ذکر کیا گیا ہے جو ایک مخصوص دور میں ان کی جانب سے اختیار کیا گیا تھا۔ اس دور میں نصاریٰ پر بحیثیتِ مجموعی



رہبانیت کا غلبہ رہا اور 'قربِ الٰہی' کا ذریعہ وطریقہ انہیں یہ سمجھ میں آیا کہ دنیا کے مشاغل اور مصروفیات سے مکمل کنارہ کشی کر کے' اس سے ہر قسم کا تعلق منقطع کر کے' یہاں تک کہ قریب ترین رشتوں کی بیڑیوں سے بھی اپنے آپ کو مکمل طور پر آزاد کر کے جنگلوں میں جا کر مکمل گوشہ خلوت وتنہائی میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا ''قرب'' حاصل کیا جائے۔ اِن کے ابتدائی افراد نے کسی قدر عزم وجزم کے ساتھ اس راہ پر سفر بھی کیا لیکن پھر اس راہ کی کٹھنائیوں نے انہیں زیر کرلیا۔ غیر فطری مجاہدے اور نفس کشی کے انتہا پسندانہ رویے پر مسلسل گامزن رہنے کے نتیجے میں پیدا ہونے والے شدید ردِعمل نے انہیں دُور کی گمراہیوں میں مبتلا کردیا۔ پھر وہی مذہبی پیشوا جو ترکِ دنیا وترکِ لذاتِ دنیا کے راستے کے راہی تھے' پوری طرح لذاتِ دنیا کے بحر میں غرق نظر آئے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے سورۃ الحدید کے آخری رکوع کی تفسیر میں اس حوالے سے نصاریٰ کی تاریخ کا تفصیل سے ذکر کیا ہے جس کی روشنی میں نصاریٰ کے کردار میں برپا ہونے والے ''انقلاب'' کو بآسانی سمجھا جاسکتا ہے۔

افراط وتفریط کے اس تذکرے کے بعد اب اس ''راہِ اعتدال'' کی وضاحت کی کوشش کی جائے گی جس کا اختیار کرنا انسانی کامیابی کے لیے ازحد ضروری ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے قرآن حکیم کی تعلیم اور نبی اکرم ﷺ کی تربیت کی بدولت اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر یہ خصوصی احسان فرمایا ہے کہ اِس کو بحیثیتِ مجموعی ایک معتدل امت بنایا ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ﴾ (البقرۃ:۱۴۳)

''اِسی طرح تو ہم نے تمہیں ایک اُمتِ وسط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔''

اس مقام وکیفیتِ وسط کی وضاحت کرتے ہوئے صاحب معارف القرآن مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں:

''اُمتِ محمدیہ کا خاص اعتدال: لفظ وَسَط بفتح السین بمعنی اوسط ہے اور خیر الامور اور افضل اشیا کو وسط کہا جاتا ہے۔ ترمذی میں بروایت ابوسعید خدریؓ آنحضرت ﷺ سے لفظ وسط کی تفسیر عدل سے کی گئی ہے جو بہترین کے معنی میں آیا ہے (قرطبی)۔ اس

آیت میں اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی ایک امتیازی فضیلت وخصوصیت کا ذکر ہے کہ وہ ایک معتدل اُمت بنائی گئی۔‘‘

اس بعد مفتی صاحبؒ اس بات کی وضاحت فرماتے ہیں کہ کس طرح وصفِ اعتدال انسانی شرف وفضیلت کا معیار ہے:

’’وصفِ اعتدال کی یہ اہمیت کہ اس کو انسانی شرفِ فضیلت کا معیار قرار دیا گیا‘ ذرا تفصیل طلب ہے۔ اس کو پہلے ایک محسوس مثال سے دیکھئے۔ دنیا کے جتنے نئے اور پرانے طریقے جسمانی صحت وعلاج کے لیے جاری ہیں‘ طب یونانی‘ ویدک‘ ایلوپیتھک‘ ہومیوپیتھک وغیرہ سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ بدن انسانی کی صحت اعتدالِ مزاج سے ہے اور جہاں یہ اعتدال کسی جانب سے خلل پذیر ہو وہی بدنِ انسانی کا مرض ہے۔ خصوصاً طب یونانی کا تو بنیادی اصول ہی مزاج کی پہچان پر موقوف ہے۔ انسان کا بدن چار خلط خون‘ بلغم‘ سودا‘ صفرا‘ سے مرکب اور انہی چاروں اخلاط سے پیدا شدہ چار کیفیات انسان کے بدن میں ضروری ہیں‘ گرمی‘ ٹھنڈک‘ خشکی اور تری۔ جس وقت تک یہ چاروں کیفیات مزاج انسانی کے مناسب حدود کے اندر معتدل رہتی ہیں وہ بدنِ انسانی کی صحت وتندرستی کہلاتی ہے اور جہاں ان میں سے کوئی کیفیت مزاج انسانی کی حد سے زیادہ ہو جائے یا گھٹ جائے وہی مرض ہے اور اگر اس کی اصلاح وعلاج نہ کیا جائے تو ایک حد میں پہنچ کر وہی موت کا پیام ہو جاتا ہے۔ اس محسوس مثال کے بعد اب روحانیت اور اخلاقیات کی طرف آیئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں بھی اعتدال اور بے اعتدالی کا یہی طریقہ جاری ہے۔ اس کے اعتدال کا نام روحانی صحت اور بے اعتدالی کا نام روحانی اور اخلاقی مرض ہے‘ اور اس مرض کا اگر علاج کر کے اعتدال پر نہ لایا جائے تو اس کا نتیجہ روحانی موت ہے۔ اور یہ بھی کسی صاحبِ بصیرت انسان پر مخفی نہیں کہ جوہر انسانیت جس کی وجہ سے انسان ساری مخلوقات کا حاکم اور مخدوم قرار دیا گیا ہے وہ اس کا بدن یا بدن کے اجزاء واخلاط یا ان کی کیفیات حرارت وبرودت نہیں‘ کیونکہ ان اَجزاء وکیفیات میں تو دنیا کے سارے جانور بھی انسانیت کے ساتھ شریک بلکہ انسانیت سے زیادہ حصہ رکھنے والے ہیں۔ جوہر انسانیت جس کی وجہ سے انسان اشرف المخلوقات اور آقائے کائنات مانا گیا ہے وہ اس کے گوشت پوست اور حرارت وبرودت وغیرہ سے بالاتر کوئی چیز ہے جو انسان میں کامل اور اکمل طور پر موجود ہے۔ دوسری مخلوقات کو اس کا وہ درجہ حاصل نہیں اور اس کا متعین کر لینا بھی کوئی باریک



اور مشکل کام نہیں کہ وہ انسان کا روحانی اور اخلاقی کمال ہے جس نے اس کو مخدوم کائنات بنایا ہے۔ مولانا رومی نے خوب فرمایا ہے:

آدمیت لحم و شحم و پوست نیست — آدمیت جز رضائے دوست نیست

اور اسی وجہ سے وہ انسان جو اپنے جوہر شرافت وفضیلت کی بے قدری کر کے اس کو ضائع کرتے ہیں‘ ان کے بارے میں فرمایا:

اینکہ می بینی خلافِ آدم اند — نیستند آدم غلافِ آدم اند

اور جب یہ معلوم ہوگیا کہ انسان کا جوہر شرافت اور مدارِ فضیلت اس کے روحانی اور اخلاقی کمالات ہیں اور یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ بدن انسانی کی طرح روح انسانی بھی اعتدال و بے اعتدالی کا شکار ہوتی ہے اور جس طرح بدن انسانی کی صحت اس کے مزاج اور اخلاط کا اعتدال ہے اسی طرح روح کی صحت روح اور اس کے اخلاق کا اعتدال ہے۔ اس لیے انسانِ کامل کہلانے کا مستحق صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جو جسمانی اعتدال کے ساتھ روحانی اور اخلاقی اعتدال بھی رکھتا ہو۔ یہ کمال تمام انبیاء کو خصوصیت کے ساتھ عطا ہوتا ہے اور ہمارے رسول کریم ﷺ کو انبیاء علیہم السلام میں بھی سب سے زیادہ یہ کمال حاصل تھا۔ اس لیے انسان کامل کے اوّلین مصداق آپ ہی ہیں‘ اور جس طرح جسمانی علاج معالجہ کے لیے ہر زمانہ اور ہر جگہ ہر بستی میں طبیب اور ڈاکٹر اور دواؤں اور آلات کا ایک محکم نظام حق تعالیٰ نے قائم فرمایا ہے‘ اسی طرح روحانی علاج اور قوموں میں اخلاقی اعتدال پیدا کرنے کے لیے انبیاء علیہم السلام بھیجے گئے۔ ان کے ساتھ آسمانی ہدایات بھیجی گئیں اور بقدرِ ضرورت مادی طاقتیں بھی عطا کی گئیں جن کے ذریعہ وہ یہ قانونِ اعتدال دنیا میں نافذ کر سکیں۔ اسی مضمون کو قرآن کریم میں سورۃ حدید میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

﴿ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ﴾ (الحدید:٢٥)

یعنی ’’ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور اتاری ان کے ساتھ کتاب اور ترازو تاکہ لوگ عدل وانصاف پر قائم ہو جائیں‘ اور ہم نے اتارا لوہا اس میں سخت لڑائی ہے اور لوگوں کے کام چلتے ہیں۔‘‘

اس میں انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے اور ان پر کتابیں نازل کرنے کی حکمت یہی بتلائی ہے کہ وہ ان کے ذریعہ لوگوں میں اخلاقی اور عملی اعتدال پیدا کریں۔ کتاب‘ اخلاقی اور روحانی

اعتدال پیدا کرنے کے لیے نازل کی گئی اور ترازو معاملات لین دین میں عملی اعتدال پیدا کرنے کے لیے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ترازو سے مراد ہر پیغمبر کی شریعت ہو جس کے ذریعے اعتدالِ حقیقی معلوم ہوتا ہے اور عدل وانصاف قائم کیا جاسکتا ہے۔ اس تفصیل سے آپ نے یہ سمجھ لیا ہوگا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے اور ان پر کتابیں نازل کرنے کی اصلی غرض وحکمت یہی ہے کہ قوموں کو اخلاقی اور عملی اعتدال پر قائم کیا جائے اور یہی قوموں کی صحت مندی اور تندرستی ہے۔

**اُمتِ محمدیہ میں ہر قسم کا اعتدال:** اس بیان سے آپ نے یہ بھی معلوم کرلیا ہوگا کہ اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی جو فضیلت مذکورہ میں بتلائی ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا﴾ (البقرۃ:۱۴۳) یعنی ''ہم نے تمہیں ایک معتدل امت بنایا ہے''۔ یہ بولنے اور لکھنے میں تو ایک لفظ ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے کسی قوم یا شخص میں جتنے کمالات اس دنیا میں ہو سکتے ہیں' ان سب کے لیے حاوی اور جامع ہے۔ اس میں امتِ محمدیہ کو 'اُمت وَسَط' یعنی 'معتدل امت' فرما کر یہ بتلا دیا کہ انسان کا جو ہر شرافت وفضیلت ان میں بدرجۂ کمال موجود ہے اور جس غرض کے لیے یہ آسمان وزمین کا سارا نظام ہے اور جس کے لیے انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں بھیجی گئی ہیں' یہ امت اس میں ساری اُمتوں سے ممتاز اور افضل ہے۔''

پھر آگے چل کر فرماتے ہیں:

''سورۂ آلِ عمران میں اُمتِ محمدیہ کے اسی اعتدالِ مزاج اور اعتدالِ روحانی کے آثار کو ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۭ﴾ (آل عمران:۱۱۰) یعنی ''تم سب اُمتوں میں بہتر ہو جو عالم میں بھیجی گئی ہو' حکم کرتے ہو اچھے کاموں کا اور منع کرتے ہو برے کاموں سے اور اللہ پر ایمان لاتے ہو''۔ یعنی جس طرح ان کو رسول سب رسولوں میں افضل نصیب ہوئے' کتاب سب کتابوں میں جامع اور اکمل نصیب ہوئی' اسی طرح ان کو قوموں کا صحت مندانہ مزاج اور اعتدال بھی اس اعلیٰ پیمانے پر نصیب ہوا کہ وہ سب امتوں میں بہتر قرار پائی۔ اس پر علوم ومعارف کے دروازے کھول دیے گئے ہیں' ایمان وعمل وتقویٰ کی تمام شاخیں ان کی قربانیوں سے سرسبز وشاداب ہوں گی۔ وہ کسی مخصوص ملک واقلیم میں محصور نہ ہوگی بلکہ اس کا دائرۂ عمل سارے عالم اور انسانی زندگی کے سارے شعبوں کو محیط ہوگا۔ گویا اس کا وجود ہی اس لیے ہوگا کہ



دوسروں کی خیر خواہی کرے اور جس طرح ممکن ہو انھیں جنت کے دروازوں پر لا کھڑا کردے۔ ﴿اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ میں اسی کی طرف اشارہ ہے کہ یہ امت دوسروں کی خیر خواہی اور فائدہ کے لیے بنائی گئی ہے۔ اس کا فرضِ منصبی اور قومی نشان یہ ہے کہ لوگوں کو نیک کاموں کی ہدایت کرے' برے کاموں سے روکے۔ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کے ارشاد ((اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ)) کا یہی مطلب ہے کہ دین اس کا نام ہے کہ سب مسلمانوں کی خیر خواہی کرے۔ پھر برے کاموں میں کفر' شرک' بدعات' رسومِ قبیحہ' فسق وفجور اور ہر قسم کی بداخلاقی اور نامعقول باتیں شامل ہیں۔ ان سے روکنا بھی کئی طرح ہوگا۔ کبھی زبان سے' کبھی ہاتھ سے' کبھی قلم سے' کبھی تلوار سے' غرض ہر قسم کا جہاد اس میں داخل ہوگیا۔ یہ صفت جس قدر عموم واہتمام سے اُمتِ محمدیہ میں پائی گئی' پہلی امتوں میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔''

چنانچہ اس کے بعد مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ سابقہ اُمتوں اور اُمتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا موازنہ کرتے ہوئے اس بات کا ذکر فرماتے ہیں کہ کس طرح اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اس امت کو اعتقاد کی سطح پر' عمل اور عبادات کی سطح پر' معاشرت وتمدن کی سطح پر' اور مالی واقتصادی نظام کی سطح پر' غرض ہر سطح پر مبنی بر اعتدال تعلیمات عطا فرمائی ہیں اور حضرتِ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی کے ذریعے اس تعلیم کے قولی وعملی بیان کے ذریعے سے اس امت کو ان گمراہیوں اور افراط و تفریط کی ان راہوں سے محفوظ کرنے کا اہتمام فرما دیا ہے کہ جن پر سابقہ امتیں اپنے رسولوں علیہم السلام کی تعلیمات سے منہ موڑنے کے نتیجے میں چل پڑی تھیں۔ پھر اس تشریح سے دیگر انتہائی اہم امور کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے خصوصی احسان کی بدولت اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اپنے مزاج اور تعلیم کے اعتبار سے راہِ اعتدال پر رکھی گئی ہے۔ اسی اعتدال کی تصویر ہمیں اس تعلیم میں بھی نظر آتی ہے کہ جس کے ذریعے اس امت کو دنیا کے ساتھ تعلق اور اسے برتنے کی نوعیت سمجھائی گئی ہے۔

چنانچہ اگر بات تفریط سے شروع کی جائے تو حضرتِ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب میں سے جن کے مزاج میں اس طرف رجحان محسوس فرمایا' ان کی اصلاح میں تاخیر نہ فرمائی۔ پھر حضراتِ صحابہ نے آپ ﷺ کی اس تعلیم کو اپنے اقوال اور کردار سے امت میں منتقل کیا جس کی بدولت بحیثیتِ مجموعی یہ اُمت رہبانیت سے محفوظ رہی۔ اسی حوالے سے سیرت النبی ﷺ سے ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ:

جَاءَ ثَلَاثَةُ رَهْطٍ اِلٰی بُیُوْتِ اَزْوَاجِ النَّبِیِّ ﷺ یَسْاَلُوْنَ عَنْ عِبَادَةِ النَّبِیِّ ﷺ فَلَمَّا اُخْبِرُوْا کَاَنَّھُمْ تَقَالُّوْھَا ، فَقَالُوْا وَاَیْنَ نَحْنُ مِنَ النَّبِیِّ ﷺ قَدْ غُفِرَ لَہٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ وَمَا تَاَخَّرَ ، قَالَ اَحَدُھُمْ اَمَّا اَنَا فَاِنِّیْ اُصَلِّی اللَّیْلَ ، وَقَالَ آخَرُ اَنَا اَصُوْمُ الدَّھْرَ وَلَا اُفْطِرُ ، وَقَالَ آخَرُ اَنَا اَعْتَزِلُ النِّسَاءَ فَلَا اَتَزَوَّجُ اَبَدًا ، فَجَاءَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِلَیْھِمْ فَقَالَ: ((اَنْتُمُ الَّذِیْنَ قُلْتُمْ کَذَا وَکَذَا! اَمَا وَاللّٰہِ اِنِّیْ لَاَخْشَاکُمْ لِلّٰہِ وَاَتْقَاکُمْ لَہٗ لٰکِنِّیْ اَصُوْمُ وَاُفْطِرُ وَاُصَلِّیْ وَاَرْقُدُ، وَاَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ ، فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ))(۱)

’’رسول اللہ ﷺ کی ازواجِ مطہرات کے گھروں میں تین آدمی آپ ﷺ کی عبادت کا حال پوچھنے آئے۔ جب ان سے بیان کیا گیا تو انہوں نے آپ ﷺ کی عبادت کو بہت کم خیال کرتے ہوئے کہا کہ ہم آپ ﷺ کی برابری کس طرح کر سکتے ہیں‘ آپؐ کے تو اگلے پچھلے سب گناہ معاف ہو گئے ہیں۔ ان میں سے ایک نے کہا: میں تو رات بھر نماز پڑھا کروں گا‘ دوسرے نے کہا: میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا اور کبھی ناغہ نہیں کروں گا‘ تیسرے نے کہا: میں نکاح نہیں کروں گا اور عورتوں سے ہمیشہ الگ رہوں گا۔ رسول اللہ ﷺ (کو جب معلوم ہوا تو آپ ﷺ) ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا: ’’کیا تم لوگوں نے یوں یوں کہا ہے؟ اللہ کی قسم! میں تم میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا اور اس کا تقویٰ اختیار کرنے والا ہوں‘ لیکن میں (نفلی) روزے رکھتا بھی ہوں اور ناغہ بھی کرتا ہوں‘ نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں‘ اور میں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ پس یاد رکھو! جو کوئی میری سنت سے روگردانی کرے گا‘ وہ میرے طریقے پر نہیں۔‘‘

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کے بارے میں جب حضرت رسول اللہ ﷺ کو یہ معلوم ہوا کہ وہ ساری رات نماز میں کھڑے رہتے ہیں‘ دن بھر روزہ رکھتے ہیں اور اپنے قریبی اعزہ اور مہمانوں وغیرہ کو بھی وقت نہیں دیتے تو آپ ﷺ نے ان کی اصلاح فرمائی۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا:

((یَا عَبْدَ اللّٰہِ! اَلَمْ اُخْبَرْ اَنَّکَ تَصُوْمُ النَّھَارَ وَتَقُوْمُ اللَّیْلَ؟)) قُلْتُ بَلٰی یَارَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: ((فَلَا تَفْعَلْ، صُمْ وَاَفْطِرْ، وَقُمْ وَنَمْ، فَاِنَّ لِجَسَدِکَ



عَلَیْکَ حَقًّا وَاِنَّ لِعَیْنِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَاِنَّ لِزَوْجِکَ عَلَیْکَ حَقًّا))(۲)

’’اے عبداللہ! کیا مجھے یہ خبر نہیں پہنچی کہ تم دن بھر روزے رکھتے ہو اور رات بھر قیام کرتے ہو؟‘‘ میں نے عرض کیا: جی ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس طرح مت کیا کرو۔ تم روزہ بھی رکھو اور ناغہ بھی کرو‘ رات کو قیام بھی کرو اور سو بھی جایا کرو‘ اس لیے کہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے‘ تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے‘ تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے۔‘‘

اسی طرح کا ایک اور اہم واقعہ وہ بھی ہے جو حضرت سلمان فارسی اور حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہما کے درمیان پیش آیا۔ چنانچہ صحیح بخاری میں اس کی تفصیل یوں بیان ہوئی ہے:

عَنْ عَوْنِ بْنِ اَبِیْ جُحَیْفَةَ عَنْ اَبِیْہِ قَالَ آخَی النَّبِیُّ ﷺ بَیْنَ سَلْمَانَ وَاَبِی الدَّرْدَاءِ، فَزَارَ سَلْمَانُ اَبَا الدَّرْدَاءِ، فَرَاٰی اُمَّ الدَّرْدَاءِ مُتَبَذِّلَةً، فَقَالَ لَھَا مَا شَاْنُکِ؟ قَالَتْ: اَخُوْکَ اَبُو الدَّرْدَاءِ لَیْسَ لَہٗ حَاجَةٌ فِی الدُّنْیَا، فَجَاءَ اَبُو الدَّرْدَاءِ فَصَنَعَ لَہٗ طَعَامًا، فَقَالَ کُلْ، قَالَ فَاِنِّیْ صَائِمٌ، قَالَ مَا اَنَا بِآکِلٍ حَتّٰی تَاْکُلَ، قَالَ فَاَکَلَ، فَلَمَّا کَانَ اللَّیْلُ ذَھَبَ اَبُو الدَّرْدَاءِ یَقُوْمُ، قَالَ نَمْ فَنَامَ، ثُمَّ ذَھَبَ یَقُوْمُ، فَقَالَ نَمْ، فَلَمَّا کَانَ مِنْ آخِرِ اللَّیْلِ قَالَ سَلْمَانُ قُمِ الْآنَ فَصَلَّیَا، فَقَالَ لَہٗ سَلْمَانُ اِنَّ لِرَبِّکَ عَلَیْکَ حَقًّا، وَلِنَفْسِکَ عَلَیْکَ حَقًّا، وَلِاَھْلِکَ عَلَیْکَ حَقًّا، فَاَعْطِ کُلَّ ذِیْ حَقٍّ حَقَّہٗ، فَاَتَی النَّبِیَّ ﷺ فَذَکَرَ ذٰلِکَ لَہٗ، فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ ((صَدَقَ سَلْمَانُ))(۳)

’’عون بن ابی جحیفہؒ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں‘ انہوں نے بیان کیا کہ نبی ﷺ نے سلمان اور ابو درداء رضی اللہ عنہما کے درمیان بھائی چارہ کرا دیا تھا۔ سلمانؓ ابو درداءؓ سے ملاقات کو گئے تو اُمّ درداءؓ کو بہت پریشان حال پایا۔ ان سے پوچھا کیا بات ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ تمہارے بھائی ابو درداء کو دنیا سے کوئی واسطہ نہیں۔ پھر ابو درداءؓ آئے تو سلمانؓ کے لیے کھانا تیار کیا اور کہا: کھاؤ‘ (پھر اپنے بارے میں بتایا کہ) میں تو (نفلی) روزے سے ہوں۔ سلمانؓ نے کہا: میں تو نہیں کھاؤں گا جب تک تم نہ کھاؤ گے۔ چنانچہ انہوں نے کھا لیا۔ جب رات ہوئی تو ابو درداءؓ اٹھ کھڑے ہوئے (تاکہ عبادت کریں)۔ سلمانؓ نے کہا سوئے رہو‘ چنانچہ وہ سو گئے۔ پھر عبادت کے لیے

کھڑے ہوئے تو سلمانؓ نے کہا سوئے رہو۔ جب رات کا آخری حصہ آیا تو سلمانؓ نے کہا کہ اب اٹھو۔ پھر دونوں نے نماز پڑھی۔ سلمانؓ نے ان سے کہا: تمہارے رب کا تم پر حق ہے' اور تمہاری جان کا تم پر حق ہے' اور تمہارے بیوی بچوں کا تم پر حق ہے' اس لیے ہر مستحق کا حق ادا کرو۔ پھر ابو درداءؓ نبی اکرم ﷺ کے پاس آئے اور آپ سے یہ واقعہ بیان کیا تو نبی ﷺ نے فرمایا: ''سلمانؓ نے درست کہا۔''

حضرت سلمان ؓ جو کہ ہجرت کے بعد ابو درداء ؓ کے بھائی بنا دیے گئے تھے' انہوں نے جس طرح نبی اکرم ﷺ کی تعلیم کے مطابق حکیمانہ انداز میں اپنے بھائی کی اصلاح فرمائی' یہ بذاتِ خود خیر خواہی کا ایک غیر معمولی مظاہرہ ہے۔ دوسری جانب حضرت رسول اللہ ﷺ کا اس اصلاح پر ثبت مہر فرمانا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ رہبانیت سے گریز ہی آپ ﷺ کی تعلیم ہے۔

اس کے بعد اگر افراط' یعنی حُبِ دنیا میں استغراق کی وجہ سے آخرت کی فراموشی کا ذکر کیا جائے تو اس طرزِ عمل کی ممانعت میں بھی کثرت سے آیاتِ قرآنیہ و ارشاداتِ رسول اللہ ﷺ وارد ہوئے ہیں۔ چنانچہ سورۃ الکہف کے آخر میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اس کیفیت کا ذکر اور اس کا انجام یوں بیان فرمایا ہے:

﴿قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۝۱۰۳ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝۱۰۴﴾

''آپؐ ان سے کہیے: کیا ہم تمہیں بتائیں کہ لوگوں میں اعمال کے لحاظ سے سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے کون ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی تمام تر کوشش دنیا کی زندگی کے لیے ہی کھپا دی پھر وہ یہ بھی سمجھے بیٹھے ہیں کہ وہ بڑے اچھے کام کر رہے ہیں!''

اسی طرح سورۂ یونس میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اپنی شدید ناراضگی کا اظہار یوں فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۝۷ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝۸﴾

''جو لوگ ہماری ملاقات کی توقع نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی پر ہی راضی اور مطمئن ہوگئے ہیں اور وہ لوگ جو ہماری قدرت کے نشانوں سے غافل ہیں' ان سب کا ٹھکانا جہنم ہے۔ یہ ان کاموں کا بدلہ ہے جو وہ کرتے رہے۔''

اسی طرح کی ناراضگی اور انجامِ بد سے دوچار کیے جانے کا ذکر سورۂ ہود میں بھی فرمایا گیا ہے۔



ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۝۱۵ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۡ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۶﴾

''جو شخص دنیا کی زندگی اور اس کی زینت چاہتا ہے تو ہم ایسے لوگوں کو دنیا میں ہی ان کے اعمال کا پورا بدلہ دے دیتے ہیں اور وہ دنیا میں گھاٹے میں نہیں رہتے۔ یہی لوگ ہیں جن کا آخرت میں آگ کے سوا کچھ حصہ نہیں' اور جو کچھ انہوں نے دنیا میں بنایا وہ برباد ہو جائے گا اور جو عمل کرتے رہے وہ بھی بے سود ہوں گے۔''

قرآنِ حکیم نے اس بات کو بھی مختلف اسالیب میں واضح فرمایا ہے کہ انسانوں کی اکثریت دنیا کی اصل حقیقت سے بے خبر اور غافل ہونے کی وجہ سے اسی عارضی اور فانی زندگی کو اپنا مطمحِ نظر بنا کر زندگی گزار رہی ہے۔ چنانچہ سورۃ النجم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى ۙ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝۲۹ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ۭ﴾

''پس جو شخص ہماری یاد سے منہ موڑتا ہے آپ اس کی پروا نہ کیجیے' ایسا شخص دُنیا کی زندگی کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا۔ ان کے علم کی پرواز بس یہیں تک ہے۔''

اس دنیا کی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کئی مقامات پر ایک بڑی بلیغ مثال بیان کی گئی تاکہ اس کی ناپائیداری کو خوب اچھی طرح واضح کر دیا جائے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ۝۴۵﴾ (الکہف)

''اور ان کے لیے دنیا کی زندگی کی یہ مثال بیان کیجیے: جیسے ہم نے آسمان سے پانی برسایا جس سے زمین کی نباتات گھنی ہوگئیں' پھر وہی نباتات ایسا بھس بن گئیں جسے ہوائیں اڑائے پھرتی ہیں۔ اور اللہ ہر چیز پر مکمل اختیار رکھنے والا ہے۔''

اسی طرح سورۃ الحدید میں ارشاد فرمایا:

﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي

الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ؕ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ؕ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۲۰﴾

''خوب جان لو کہ دنیا کی زندگی محض کھیل تماشا' زینت و آرائش' تمہارا آپس میں ایک دوسرے پر فخر کرنا اور مال و اولاد میں ایک دوسرے سے زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ جیسے بارش ہوئی تو اس کی نباتات نے کاشتکاروں کو خوش کر دیا' پھر وہ جوبن پر آتی ہے' پھر تو اسے زرد پڑی ہوئی دیکھتا ہے' پھر (آخر کار) وہ بُھس بن جاتی ہے۔ جبکہ آخرت میں (ایسی غفلت کی زندگی کا بدلہ) سخت عذاب ہے اور (ایمان والوں کے لیے) اللہ کی بخشش اور رضا ہے۔ اور دنیا کی زندگی تو محض دھوکے کا سامان ہے۔''

دنیا کی اس حقیقت کا ادراک اور تیقن پیدا کر لینے کے بعد آخری اہم بات یہ ہے کہ پھر اس دنیا کے ساتھ تعلق کی صحیح شکل کیا ہے اور اس دنیا کو کس طرح برتا جائے؟ یہاں زندگی کس نقطہ نظر کے تحت گزاری جائے؟ حضرت رسول اللہ ﷺ نے اپنے ارشاداتِ مبارکہ میں ان تمام امور کی نہ صرف وضاحت فرمائی بلکہ اپنی سیرت و کردار سے بھرپور عملی نمونہ بھی پیش فرما دیا۔ اس ضمن میں ہماری رہنمائی کے لیے ایک ہی حدیثِ مبارکہ کفایت کرے گی:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ اَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِبَعْضِ جَسَدِیْ فَقَالَ: ((كُنْ فِي الدُّنْيَا كَاَنَّكَ غَرِيْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ ، وَعُدَّ نَفْسَكَ فِيْ اَهْلِ الْقُبُوْرِ)) فَقَالَ لِی ابْنُ عُمَرَ: اِذَا اَصْبَحْتَ فَلَا تُحَدِّثْ نَفْسَكَ بِالْمَسَاءِ وَاِذَا اَمْسَيْتَ فَلَا تُحَدِّثْ نَفْسَكَ بِالصَّبَاحِ ، وَخُذْ مِنْ صِحَّتِكَ قَبْلَ سَقَمِكَ وَمِنْ حَيَاتِكَ قَبْلَ مَوْتِكَ ، فَاِنَّكَ لَا تَدْرِیْ يَا عَبْدَ اللّٰهِ مَا اسْمُكَ غَدًا))(۴)

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے میرے بدن کا ایک حصہ پکڑ کر فرمایا: ''دنیا میں کسی مسافر یا کسی راہ گیر کی طرح رہو اور خود کو قبر والوں میں شمار کرو''۔ مجاہدؒ کہتے ہیں کہ پھر ابن عمرؓ نے مجھ سے فرمایا: اگر تمہیں صبح نصیب ہو جائے تو شام کا بھروسہ نہ کرو اور اگر شام نصیب ہو جائے تو صبح کا انتظار نہ کرو۔ بیماری آنے سے پہلے صحت سے اور موت آنے سے پہلے زندگی سے فائدہ حاصل کرو' کیونکہ تمہیں نہیں معلوم کہ کل تمہارا شمار کن میں ہوگا (زندوں میں یا مُردوں میں!)''



گویا دنیا کو عارضی ٹھکانہ سمجھتے ہوئے اصل منزل یعنی آخرت کے لیے تیاری کی جائے۔ نہ اختیارِ رہبانیت کی شکل میں اپنی دینی ذمہ داریوں کی ادائیگی سے راہِ فرار اختیار کی جائے اور نہ دنیائے دُوں کی محبت میں ڈوب کر اپنی اصل منزل کھوٹی کی جائے۔ حضرت رسول اللہ ﷺ نے اپنے ارشادات میں ہمیں اس بات سے خوب خبردار فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

(( فَوَاللّٰهِ مَا الْفَقْرَ اَخْشٰى عَلَيْكُمْ وَلٰكِنِّیْ اَخْشٰى عَلَيْكُمْ اَنْ تُبْسَطَ الدُّنْيَا عَلَيْكُمْ كَمَا بُسِطَتْ عَلٰى مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ، فَتَنَافَسُوْهَا كَمَا تَنَافَسُوْهَا وَتُهْلِكَكُمْ كَمَا اَهْلَكَتْهُمْ)) وَفِیْ رِوَايَةٍ ((وَتُلْهِيَكُمْ كَمَا اَلْهَتْهُمْ))(۵)

''اللہ کی قسم! مجھے تم پر فقر کا ڈر نہیں ہے بلکہ مجھے اس بات کا ڈر ہے کہ کہیں تم پر دنیا کشادہ نہ کر دی جائے جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر کشادہ کر دی گئی تھی' پھر تم اس کی خاطر ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش کرو جس طرح ان لوگوں نے اس کی خاطر ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش کی تھی' اور یہ تمہیں اسی طرح ہلاک کر دے جیسا کہ اس نے تم سے پہلے لوگوں کو ہلاک کیا تھا''۔ جبکہ ایک دوسری روایت میں آپ ﷺ کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: ''وہ تمہیں بھی اسی طرح غفلت میں ڈال دے جس طرح کہ اس نے تم سے پہلے لوگوں کو غفلت میں ڈالا تھا۔''

اسی طرح دنیا کے لالچ اور دھوکے سے بچنے کے لیے فرمایا:

((اِذَا نَظَرَ اَحَدُكُمْ اِلٰى مَنْ فُضِّلَ عَلَيْهِ فِی الْمَالِ وَ الْخَلْقِ فَلْيَنْظُرْ اِلٰى مَنْ هُوَ اَسْفَلَ مِنْهُ مِمَّنْ فُضِّلَ عَلَيْهِ))(۶)

''جب تم میں سے کوئی اُس آدمی کی طرف دیکھے کہ جسے مال اور جسم (صحت اور شکل و صورت) میں اس پر فضیلت دی گئی ہے تو وہ اُس آدمی کی طرف بھی دیکھے جو اس فضیلت کے اعتبار سے اس سے کم تر ہے۔''

اسی کی عملی تصویر ہمیں اس دعا میں بھی نظر آتی ہے جو رسول اللہ ﷺ اپنے اور اپنے گھر والوں کے لیے مانگا کرتے تھے کہ:

((اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ رِزْقَ اٰلِ مُحَمَّدٍ قُوْتًا)) وفی رواية ((كَفَافًا))(۷)

ترجمہ: ''اے اللہ! محمد ﷺ کے گھر والوں کو بقدرِ کفاف رزق عطا فرما۔''

اور پھر ایک دوسرے ارشاد میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی خوشنودی کی علامت اس بات کو قرار دیا کہ بندہ دنیا کی محبت سے بچا لیا جائے۔ چنانچہ فرمایا:

((اِذَا اَحَبَّ اللّٰہُ عَزَّ وَ جَلّ عَبدًا حَمَاہُ الدُّنْیَا کَمَا یَحْمِی اَحَدُکُمْ مَرِیْضَہُ الْمَاءَ))(۸)

’’جب اللہ عزوجل کسی بندہ سے محبت فرماتا ہے تو اسے دنیا سے اس طرح پرہیز کراتا ہے جیسے تم میں سے کوئی اپنے مریض کو پانی سے پرہیز کراتا ہے۔‘‘

اسی طرح زندگی کی طوالت کی امید پر آخرت کی تیاری کو مؤخر نہ کیا جائے‘ بلکہ وہ وقت جو اِس وقت ہمارے ہاتھ میں ہے یعنی آج کا دن یا حال (Present)‘ اس سے پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ انصاف سے غور کیا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ انسان کے پاس اصل وقت تو وہی ایک دن ہے جو کہ وہ اِس وقت گزار رہا ہے۔ ماضی گزر چکا اور اب کبھی لوٹ کر نہ آئے گا۔ اسی طرح مستقبل بھی انتہائی غیر یقینی ہے کہ نہ جانے ہماری زندگیوں میں آئے گا بھی یا نہیں۔ ایک عجیب وغریب حقیقت جس کا اظہار حضرت رسول اللہﷺ نے حضرت انس ؓ سے مروی اپنے ایک ارشادِ مبارک میں فرمایا وہ یہ ہے کہ:

((یَکْبَرُ ابْنُ آدَمَ وَیَکْبَرُ مَعَہُ اثْنَانِ: حُبُّ الْمَالِ وَ طُوْلُ الْعُمُرِ))(۹)

’’آدم کا بیٹا بڑا ہوتا جاتا ہے (یعنی اس کی عمر بڑھتی جاتی ہے) اور اُس کے ساتھ دو (خواہشات) بھی بڑی ہوتی جاتی ہیں: مال کی محبت اور عمر کی درازی (کی خواہش)۔‘‘

حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے کہ بڑھتی عمر کے ساتھ انسان کی ’’امید‘‘ میں کمی آنی چاہیے‘ لیکن غافل انسان اس حقیقت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا پاتا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جب کوئی ہدایت کی بات یا نصیحت دل کو نرم کر دیتی ہے تو انسان نفس کی شرارت کی بنا پر زندگی کی طوالت کی امید رکھتے ہوئے اس ہدایت کی بات پر عمل کو مؤخر کرتا جاتا ہے۔ پھر ایسے لوگ اچھے مستقبل کی تعمیر کی منصوبہ بندیاں تو خوب کرتے ہیں لیکن جب اس کی تعمیر کے لیے عملی پیش قدمی کا آغاز کرنا ہو تو اسے اگلے دن یا آنے والے وقت کے لیے مؤخر کرتے جاتے ہیں۔ ایسا کرنے والے کبھی ہاتھوں میں موجود وقت سے فائدہ نہیں اٹھا پاتے۔ ٹال مٹول کی یہ عادت انسان کو زندگی کا ہر دن ضائع کرنے پر آمادہ کر دیتی ہے۔ پھر اسی ٹال مٹول میں ایک ایک کر کے زندگی کے تمام دن گزر جاتے ہیں اور انسان کی موت اس کے سر پہ آ کھڑی ہوتی ہے۔ قرآنِ حکیم نے ایسے ہی غافل انسانوں کی اس وقت کی کیفیت کا تذکرہ کئی مقامات پر فرمایا ہے کہ کس طرح پھر وہ مزید کچھ وقت عنایت کیے جانے کی التجائیں کرتے رہ جاتے ہیں‘ لیکن اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا اٹل



قانون نافذ ہو کر رہتا ہے اور انہیں اس وقت ایک لمحے کی بھی مزید مہلت نہیں دی جاتی۔ اس لیے اصل عقل مندی یہی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے جو نصیحت حضرت مجاہدؒ کو فرمائی ہے‘ اس پر عمل کیا جائے اور موجودہ وقت کو ماضی اور مستقبل کی سوچوں میں صَرف کرنے کے بجائے اپنے فرائض کی فوری ادائیگی کی تگ ودو میں لگایا جائے۔ اس کے ایک ایک لمحے کو دنوں اور منٹوں کو سالوں کے برابر گردانتے ہوئے وقت کو مفید اور بامقصد امور میں کھپایا جائے۔ یہی طرزِ عمل انسان کی کامیابی کے لیے ازحد ضروری ہے اور حضرت رسول اللہﷺ نے بھی اسی کی تلقین فرمائی ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں حضرت رسول اللہﷺ نے ایک شخص کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

((اِغْتَنِمْ خَمْسًا قَبْلَ خَمْسٍ: شَبَابَکَ قَبْلَ ھَرَمِکَ‘ وَصِحَّتَکَ قَبْلَ سَقَمِکَ‘ وَغِنَاکَ قَبْلَ فَقْرِکَ‘ وَفَرَاغَکَ قَبْلَ شُغْلِکَ‘ وَحَیَاتَکَ قَبْلَ مَوْتِکَ))(۱۰)

’’تم پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جانو! اپنی جوانی کو ضعیفی سے پہلے‘ صحت کو بیماری سے پہلے‘ مالداری کو تنگ دستی سے پہلے‘ فرصت کو مشغولیت سے پہلے‘ اور زندگی کو موت سے پہلے۔‘‘

## حواشی

(۱) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب الترغیب فی النکاح۔
(۲) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب لزوجك علیك حق۔
(۳) صحیح البخاری، کتاب الصوم، باب من أقسم علی أخیه لیفطر......
(۴) سنن الترمذی، ابواب الزھدِ عن رسول اللّٰہِ ﷺ، باب ما جاء فی قصرِ الامل۔
(۵) صحیح مسلم، کتاب الزھد والرقائق، باب منه۔
(۶) ایضاً۔
(۷) ایضاً۔
(۸) المستدرك علی الصحیحین للحاکم، کتاب الرقاق، باب اذا احب اللّٰہ عبدا......
(۹) صحیح البخاری، کتاب الرقائق، باب من بلغ ستین سن فقد اعذر اللّٰہ الیه فی العمر......
(۱۰) المستدرك علی الصحیحین للحاکم، کتاب الرقاق، باب اغتنم خمسا قبل خمس......

# قیام اللیل (تہجّد) کی فضیلت

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

قرآن مجید میں دو دفعہ تہجد کی نماز کا ذکر ہے۔ ایک دفعہ سورۂ بنی اسرائیل میں اور ایک دفعہ سورۃ المزمل میں۔ یہ دونوں سورتیں مکی ہیں۔ مکہ میں پنجگانہ فرض نمازوں سے قبل مسلمان رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تہجد کی نماز ادا کرتے تھے۔ ہجرتِ مدینہ سے پہلے آپؐ کا سفرِ معراج ہوا جس میں آپؐ پر اور آپؐ کی اُمت پر ہر روز پانچ نمازیں ادا کرنا فرض ہوا اور تہجد کی نماز کی حیثیت نفل نماز کی ہوگئی۔ صحابہ کرام ؓ پھر بھی تہجد شوق سے پڑھتے تھے۔

تہجد اس نماز کو کہتے ہیں جو عشاء کی نماز کے بعد پڑھی جائے۔ اصطلاحِ شرع میں نماز تہجد وہ نماز ہے جو عشاء کی نماز پڑھ کر کچھ دیر سو کر اٹھنے کے بعد ادا کی جاتی ہے۔ نمازِ تہجد کے علاوہ چاشت‘ اشراق اور اوّابین وغیرہ نفلی نمازیں ہیں‘ مگر تہجد کو دیگر تمام نفلی نمازوں پر فوقیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُمت کے مشاہیر علماء‘ بزرگ اور اہلِ تقویٰ اس نماز کے پابند رہے۔

سورۂ بنی اسرائیل میں جہاں رسول اللہ ﷺ کو قرآن کے ساتھ جاگتے رہنے کی تلقین ہے وہاں یہ بھی ذکر ہے کہ کیا عجب آپؐ کا رب آپؐ کو مقامِ محمود پر کھڑا کر دے۔ گویا تہجد کی نماز کو مقامِ محمود کے ساتھ خصوصی نسبت ہے۔ مقامِ محمود تمام انبیاء میں سے آنحضرت ﷺ کے لیے مخصوص ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق یہ مقام شفاعت کبریٰ کا ہے کہ میدانِ حشر میں جب تمام بنی آدم جمع ہوں گے اور ہر نبی و پیغمبر سے شفاعت کی درخواست کریں گے تو تمام انبیاء عذر کر دیں گے‘ صرف محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو یہ شرف حاصل ہوگا کہ وہ بنی آدم کی شفاعت فرمائیں۔ لوگ حالت اضطراب سے نجات پائیں گے اور سب سے پہلے آپؐ کے ہاتھ پر بابِ شفاعت کھلے گا۔ (دائرہ معارف اسلامیہ)

دن کی روشنی کام کاج کے لیے ہے اور رات سونے کا وقت ہے‘ تاکہ آدمی دن بھر کی مصروفیت کے بعد رات کو آرام کر کے اپنی تھکاوٹ دور کرے اور اگلے دن کے کام کے لیے



تازہ دم ہو جائے۔ لیکن رات کے اوقات کو صرف سونے اور آرام کے لیے وقف کر دینا مستحسن نہیں۔ عشاء اور فجر کی نمازوں کے درمیان کا وقفہ بڑا قیمتی ہوتا ہے۔ فضا میں جیسا سکون رات کے سناٹے میں ہوتا ہے ایسا دوسرے کسی وقت میں نہیں ہوتا۔ اگر آدمی عشاء کے بعد سو جائے اور پھر جاگ کر اللہ کی یاد میں لگ جائے‘ پھر فجر کی نماز ادا کرے تو رات کے وقت کا اس طرح گزارنا دینی اور دنیوی اعتبار سے بڑا فائدہ مند ہے۔ رات کے تیسرے پہر بستر چھوڑ کر اللہ کے حضور نماز میں کھڑے ہو جانا نفس کی ریاضت اور تربیت کا خاص وسیلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ بندوں کی تعریف سورۃ السجدہ میں ان الفاظ میں کی گئی ہے:

﴿تَتَجَافٰی جُنُوۡبُهُمۡ عَنِ الۡمَضَاجِعِ یَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ خَوۡفًا وَّ طَمَعًا ۫﴾ (آیت ۱۶)

’’ان کے پہلو خواب گاہوں سے الگ رہتے ہیں۔ وہ اس وقت اپنے پروردگار سے امید اور بیم کے ساتھ دعائیں کرتے ہیں۔‘‘

یہ وقت لوگوں کے گہری نیند سونے کا ہوتا ہے‘ مگر اللہ کے پیارے بندے شوقِ عبادت میں اس پُرسکون وقت اور ماحول میں مالکِ ارض و سما کے حضور کھڑے ہو کر اُس کی تسبیح اور تقدیس میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اُس سے دین و دنیا کی فلاح طلب کرتے ہیں‘ اپنی خطاؤں کی معافی چاہتے ہیں اور اپنی حاجات مانگتے ہیں۔ اس وقت کی خاص بات یہ ہے کہ نماز میں مصروف شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ لو لگائے ہوتا ہے اور اس کی یہ عبادت قطعاً بے ریا ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے گھر والے بھی اس کی اس عبادت سے بے خبر ہوتے ہیں۔ نیکی کا بے ریا کام نہایت قیمتی ہوتا ہے‘ کیونکہ ایسا بندہ کسی سے نہ اجر کا خواہاں ہوتا ہے نہ تعریف کا۔ وہ سرے سے اس نماز کا دوسروں سے ذکر نہیں کرتا۔ اس نماز کا مقام گھر ہے تاکہ بندے کی یہ عبادت مکمل طور پر خلوص پر مبنی ہو۔ اس طرح یہ نماز عوام الناس سے خفیہ رہے اور اس میں کسی طرح کی نمود و نمائش نہ ہو اور ایسی ہی عبادت پر بھرپور اجر کا وعدہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو نمازِ تہجد کے ساتھ خصوصی نسبت تھی۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (نمازِ تہجد میں) اس قدر لمبا قیام کیا کہ آپ کے قدم مبارک متورم ہو گئے۔ آپؐ سے عرض کیا گیا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں جبکہ آپؐ کی اگلی پچھلی ساری تقصیریں معاف ہو گئی ہیں! (یعنی قرآن مجید میں اس بات کا اعلان ہو چکا ہے) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’کیا میں (اللہ تعالیٰ کے احسانِ عظیم کا) زیادہ شکر کرنے والا بندہ نہ بنوں؟‘‘ (صحیح

بخاری وصحیح مسلم) رسول اللہ ﷺ اُمت کے لیے اُسوۂ حسنہ ہیں' اگرچہ یہ نماز فرض نہیں ہے لیکن جن کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خصوصی محبت کا دعویٰ ہے اُن کے لیے تو یہ نماز فرض نمازوں کے بعد سب سے زیادہ مرغوب ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''رات کی نفل نماز دن کی نفل نماز سے ایسی ہی افضل ہے جیسا کہ چھپ کر دیا ہوا صدقہ اعلانیہ صدقہ سے افضل ہے''۔ (طبرانی' بحوالہ منتخب احادیث از مولانا محمد یوسف کاندھلوی) یہی وجہ ہے کہ اُمت کے متقی اور پرہیزگار بزرگ ہمیشہ رات کی اس نماز کے قائل رہے اور محبت اور چاہت کے ساتھ قیام اللیل پر عمل پیرا رہے۔ نمازِ تہجد کی فضیلت آپ ﷺ کے فرامین سے ظاہر ہے۔ آپ نے کئی موقعوں پر اس نماز کی تلقین کی۔ حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم تہجد ضرور پڑھا کرو' کیونکہ وہ تم سے پہلے صالحین کا طریقہ اور شعار رہا ہے اور قربِ الٰہی کا خاص وسیلہ ہے' اور وہ گناہوں کے برے اثرات کو مٹانے والی اور معاصی سے روکنے والی ہے۔'' (جامع ترمذی)

رات کی یہ عبادت اللہ تعالیٰ کو اس قدر پسند ہے کہ وہ رات کے آخری حصہ میں اپنی خصوصی شانِ رحمت کے ساتھ اپنے بندوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور ان کی دعاؤں کو سنتا اور قبول کرتا ہے۔ اُمت کے چنیدہ افراد جو رضائے الٰہی کی طلب کا شوق رکھتے ہیں وہ ضرور اس عبادت کے لیے جاگ کر اللہ کی خصوصی رحمت اور برکت سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہمارا رب تبارک وتعالیٰ ہر رات کو جس وقت آخری تہائی رات باقی رہ جاتی ہے سماءِ دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے اور ارشاد فرماتا ہے کون ہے جو مجھ سے دعا کرے اور میں اس کی دعا قبول کروں! کون ہے جو مجھ سے مانگے میں اس کو عطا کروں! کون ہے جو مجھ سے مغفرت اور بخشش چاہے میں اس کو بخش دوں!'' (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

اللہ تعالیٰ کی رحمت کی اس ارزانی کا تقاضا ہے کہ رات کے آخری پہر میں فجر کی نماز سے پہلے آدمی بستر چھوڑ دے اور وضو کر کے دست بستہ اپنے رب کے سامنے حاضر ہو جائے اور نمازِ تہجد ادا کرے اور رسول اللہ ﷺ کی تلقین کردہ وہ دعائیں کریں جن میں اپنی کمزوری کا بار بار اقرار کرے اور اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتمجید کے ساتھ اس کی عظمت' بزرگی اور کبریائی کا اعتراف کرے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے کہ اُس نے اس بابرکت گھڑی سے فائدہ اٹھانے کی توفیق دی۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا کہ نمازِ تہجد دوسری تمام نفل نمازوں پر خصوصی فضیلت رکھتی ہے۔



چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''فرض نمازوں کے بعد سب سے افضل نماز وہ ہے جو رات کے درمیان پڑھی جاتی ہے (یعنی تہجد)''۔ (صحیح مسلم)

قرآن مجید میں پسندیدہ کردار ان لوگوں کا بیان ہوا ہے جو نیکیوں میں ایک دوسرے سے بڑھنے کا داعیہ رکھتے ہوں۔ پس اللہ تعالیٰ کی اس فضیلت مآب عبادت کو بندہ نہ صرف خود اختیار کرے بلکہ اپنے پیاروں' دوستوں اور متعلقین کو بھی اس کی نصیحت کرے۔ کیونکہ مسلمان کا یہ شعار ہے کہ جس چیز کو وہ خود پسند کرے اسی چیز کو دوسروں کے لیے بھی چاہے۔ مرد خود نمازِ تہجد کا عادی بنے اور اپنی بیوی کو بھی اس کی نصیحت کرے' اسی طرح اگر بیوی خود عبادت کا شوق رکھتی ہو تو وہ اپنے مرد کو اس نماز کی ترغیب دے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کی رحمت اس بندے پر جو رات کو اٹھا اور اس نے نمازِ تہجد پڑھی اور اپنی بیوی کو بھی جگایا اور اس نے بھی نماز پڑھی۔ اور اگر (نیند کے غلبے کی وجہ سے) وہ نہیں اٹھی تو اس کے منہ پر پانی کا ہلکا سا چھینٹا دے کر اس کو بیدار کر دیا۔ اسی طرح اللہ کی رحمت اس بندی پر جو رات کو نماز تہجد کے لیے اٹھی اور اس نے نماز ادا کی اور اپنے شوہر کو بھی جگایا' پھر اس نے بھی اٹھ کر نماز پڑھی۔ اور اگر وہ نہ اٹھا تو اس کے منہ پر پانی کا ہلکا سا چھینٹا دے کر اٹھا دیا''۔ (سنن ابی داؤد' سنن نسائی)

صحابہ کرام اور صحابیات رضی اللہ عنہم کو رسول اللہ ﷺ سے اس نماز کی فضیلت پر گہرا یقین تھا۔ یہ ان کی آپس میں محبت اور خیر خواہی کا جذبہ تھا کہ مرد تہجد پڑھتا تھا تو وہ اپنی عورت کو بھی آمادہ کرتا تھا کہ وہ بھی رب کی رحمت کا مزہ لوٹے۔ اسی طرح صحابیات بھی اپنے شوہروں کو قول و فعل سے اس نماز کو اختیار کرنے پر آمادہ کرتی تھیں۔

اسلام کے تمام حکموں میں انسانی کمزوریوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ نمازِ تہجد کے معاملے میں بھی اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص تہجد پڑھنے کا عادی ہو اور نیند کے غلبہ کی وجہ سے (کسی رات) اس کی آنکھ نہ کھلی تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے تہجد کا ثواب لکھ دیتے ہیں اور اس کا سونا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک انعام ہے کہ بغیر تہجد پڑھے اسے تہجد (اس رات) پڑھنے کا ثواب مل جاتا ہے''۔ (نسائی)

چونکہ تہجد کی یہ نماز خصوصی فضیلت کی حامل ہے اس لیے اس کو اختیار کر کے پھر چھوڑ دینا اچھا نہیں سمجھا گیا۔ آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمروؓ کو فرمایا: ''عبداللہ! تم فلاں کی طرح مت ہو جانا کہ وہ رات کو تہجد پڑھا کرتا تھا' پھر اس نے چھوڑ دی''۔ (صحیح بخاری)

❁❁❁

# مولانا ظفر علی خانؒ کا قرآن مجید سے شغف

حافظ محمد مشتاق ربانی☆

مولانا ظفر علی خانؒ کی شخصیت جس عہد سے تعلق رکھتی ہے اس میں عربی زبان کو خاص مقام حاصل تھا۔کوئی بھی ادیب' شاعر اور دانشور عربی سے بے نیاز نہیں ہوسکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی شخصیت کی سوانح پڑھ لیں جس کا تعلق ظفر علی خان مرحوم کے دَور یا ان سے پہلے کے دور سے ہو وہ عربی اور فارسی کا ماہر ہوگا۔ پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اپنی کتاب ''مولانا ظفر علی خاں'' میں ذکر کرتے ہیں کہ ''ظفر علی خان نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اس میں دینی اَقدار وروایات کو خاص اہمیت حاصل تھی اور عربی وفارسی درسیات کا سلسلہ ابتدائی تعلیم کا لازمی حصہ تھا''۔ظفر علی خان جب ایم اے او کالج علی گڑھ میں طالب علم تھے تو وہاں عربی زبان کے حوالے سے ایک انجمن ''لجنة الادب'' قائم تھی' جس کے آپ رکن تھے۔

ظفر علی خان کا دین اسلام سے خاص لگاؤ تھا۔ آپ نے مولانا شبلی نعمانیؒ کی معرکۃ الآرا کتاب ''الفاروق'' کا انگریزی میں ترجمہ کیا' اور ولیم ڈریپر کی کتاب History of the Conflict between Religion and Science کا ''معرکہ مذہب وسائنس'' کے نام سے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ دونوں ترجمے ان کے دین سے گہرے لگاؤ کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اسی طرح ''ارمغانِ قادیان'' ان کی تصنیف ہے جو حبِ رسول ﷺ اور دفاعِ ناموسِ رسالت کا مظہر ہے۔

مولانا ظفر علی خان نے قرآن ہی سے یہ بات سمجھی کہ قرآن مجید کی تلاوت اور مطالعہ سے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس حقیقت کا اظہار انہوں نے اپنے اس مشہور شعر میں بڑی خوبصورتی سے فرمایا:

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں!

☆ hafizmushtaq76@yahoo.com



ان کے دور میں فلسفہ کو ایک مقام حاصل تھا' لیکن وہ سمجھتے تھے کہ ایمان فلسفہ کی موشگافیوں اور بحثوں میں الجھنے سے نہیں بڑھے گا' بلکہ قرآن مجید پر تدبر کرنے سے حاصل ہوگا۔ ایمان کا منبع وسرچشمہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے' ازروئے ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا﴾ (الانفال:۲) ''اور جب ان پر قرآن مجید کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو ان کے ایمان وایقان میں اضافہ ہو جاتا ہے''۔ مولانا صاحب نے بجا طور پر اپنے شعر میں ''عاقل'' کا لفظ استعمال کیا ہے جس سے مولانا کی قرآن فہمی واضح ہوتی ہے' کیونکہ قرآن مجید پر تدبر وتفکر کا ذوق رکھنے والوں ہی کے لیے قرآن خاص طور پر ایمان کے اضافے کا موجب ہے۔

ستمبر ۱۹۲۰ء میں مولانا صاحب کے خلاف مقدمہ قائم ہوا۔ پولیس انہیں گرفتار کر کے لے گئی تو جیل میں ان کے لیے جو ضرورت کا سامان بھیجا گیا ان میں بستر اور کپڑوں کے چند جوڑوں کے علاوہ قرآن حکیم کا ایک نسخہ بھی تھا' جو زنداں میں آپ کا سہارا اور مونس وغم خوار رہا۔ وہ انہیں قید وبند کی صعوبتیں جھیلنے کا حوصلہ دیتا' ان میں جرأت وبے باکی پیدا کرتا اور انہیں آئندہ کی صحیح پالیسی طے کرنے میں معاونت فراہم کرتا' کیونکہ قرآن ایک نور ہے جو نہ صرف روح کی تازگی اور بالیدگی کا باعث بنتا ہے بلکہ تلاوت کرنے والے کے دل ودماغ میں روشنی اور اجالا پیدا کر دیتا ہے' جس سے اسے ہر چیز کی حقیقت نظر آنا شروع ہو جاتی ہے اور اسے ایک بصیرت حاصل ہو جاتی ہے جس سے قرآن سے تعلق نہ رکھنے والے محروم ہوتے ہیں۔

مرحوم عنایت اللہ نسیم سوہدروی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ مولانا مرتضیٰ احمد میکش سنٹرل جیل لاہور میں ۱۹۳۲ء میں مولانا کے ساتھ رہے۔ ان کے مطابق مولانا ظفر علی خان علی الصبح تین بجے بیدار ہوتے اور وضو کر کے جیل کے صحن میں ٹہل ٹہل کر بلند آواز سے تلاوتِ قرآن مجید کرتے تا آنکہ صبح کی سفیدی نمودار ہو جاتی۔ (بحوالہ ظفر علی خان اور ان کا عہد' از عنایت اللہ نسیم سوہدروی' صفحہ ۱۰۵)

مولانا نے کئی نظموں کے عنوان ہی قرآن مجید کے جملوں کو بنایا ہے' جیسے ان کی کتاب ''بہارستان'' میں ایک نظم ''اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ'' کے عنوان سے ہے' اور یہ کلمات سورۃ الحجرات (آیت ۱۳) میں وارد ہوئے ہیں۔ ایک نظم کا عنوان ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ﴾ جو سورۃ الرعد کی آیت ۱۱ کے الفاظ ہیں۔ اس آیت کا مفہوم مولانا نے اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے جسے بہت قبولِ عام حاصل ہوا ہے۔

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا!

اسی طرح مولانا کا یہ شعر ؎

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا!

اپنے اندر سورۃ الصّف کی آیت ﴿یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ⑧﴾ کا مفہوم سموئے ہوئے ہے۔

’’بہارستان‘‘ ہی کی ایک نظم کا عنوان ہے: ﴿لَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ﴾ جو سورۃ یوسف (آیت ۸۷) میں واردشدہ الفاظ ہیں۔ اگر ان کی باقی شاعری کی کتابوں کو سامنے رکھا جائے‘ جیسے خیالستان اور چمنستان‘ اور ان میں وہ نظمیں الگ کی جائیں جن کے عنوانات قرآنی آیات اور جملوں پر مشتمل ہیں تو ایک طویل فہرست بن جائے گی۔ ظاہر ہے ایسا کام وہی شاعر کرسکتا ہے جو قرآن مجید سے گہرا شغف رکھتا ہو۔

مولانا ظفر علی خان ایک اعتبار سے مفسرِ قرآن بھی ہیں‘ کیونکہ انہوں نے ’’غلبہ روم‘‘ کے نام سے سورۃ الروم کی ابتدائی آیات کی تاریخی تفسیر لکھی جو خاص پہلو سے ایک منفرد کام ہے۔ قرآن حکیم میں رومیوں کی عنقریب فتح کے حوالے سے جو پیشین گوئی کی گئی وہ واقعتاً ’’بِضْعِ سِنِيْنَ ‘‘(چند سالوں) میں پوری ہوگئی۔ اس پیشین گوئی سے قرآن مجید کی حقانیت واضح ہوگئی اور یہ بھی ثابت ہوا کہ قرآن حکیم صرف ماضی کے حوالے سے نہیں ہے بلکہ حال اور مستقبل سے بھی متعلق ہے۔ واضح رہے کہ مفسرِ قرآن صرف وہی نہیں ہوتا جو پورے قرآن کی تفسیر لکھے۔ ہمارے اسلاف میں کئی ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جنہوں نے قرآن کی چند سورتوں کی تفسیر لکھی لیکن وہ بڑے بڑے مفسرین کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ علامہ اقبال نے قرآن حکیم کی کوئی تفسیر نہیں لکھی‘ لیکن وہ اپنی شاعری اور نثر میں جو قرآنی موضوعات لائے ہیں اور جو تلمیحات استعمال کی ہیں اس کی بنا پر انہیں قرآن کا شارح اور ترجمان کہا جاتا ہے۔

مولانا ظفر علی خان ان نام نہاد اہلِ قرآن کی حمایت ہرگز نہیں کرتے تھے جو اَسلاف سے منقطع تھے اور قرآن کی تعبیر اور تاویل پیش کرتے ہوئے اصولِ تفسیر کو ملحوظ نہیں رکھتے تھے۔ مولانا کے کلام کی صحیح تفہیم کے لیے جہاں ان کے عہد کے حالات سے واقفیت ضروری ہے وہیں اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ عربی سے آشنائی ہو‘ کیونکہ ان کے کلام میں عربی کے



کلمات اور قرآنی تلمیحات کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ ویسے بھی ان کے کلام کا رخ اسلام کی طرف ہے۔ تقریباً ہر نظم میں اسلام کی حمایت پائی جاتی ہے۔ لہٰذا اگر انہیں ’’شاعرِ اسلام‘‘ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔

مولانا ظفر علی خان کی شخصیت میں جو بہادری نمایاں نظر آتی ہے وہ توحید کے ماننے‘ نبی محتشم ﷺ سے سچی عقیدت اور قرآن مجید کا باقاعدگی سے مطالعہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ وہ ہمیں راستہ دکھا گئے ہیں کہ اللہ کے سوا کسی کے آگے جھکنا نہیں۔ حق بات کو ہر صورت میں بیان کرنا ہے چاہے کال کوٹھریوں میں بند ہونا پڑے۔ یہ امور اسی بندۂ مؤمن میں پیدا ہو سکتے ہیں جو تلاوتِ قرآن کو اپنا معمول بنائے‘ اس کی آیات سے تذکر حاصل کرے‘ اس کے مفہوم پر تدبر کرے اور اس پر دل و جان سے عمل کرے۔ قرآن حکیم چونکہ نبی مکرم ﷺ کے اخلاق کا عملی نمونہ ہے اس لیے احادیثِ نبویہ سے خصوصی شغف رکھے اور اپنی سرگرمیوں کا رخ دینِ اسلام کی طرف رکھے۔

ڈاکٹر زاہد منیر عامر نے ’’ظفر علی خان...... خطوط و خیوط‘‘ کے عنوان سے مولانا ظفر علی خان کے غیر مطبوعہ خطوط کی روشنی میں ایک شخصی مطالعہ پر مشتمل کتاب مرتب کی ہے۔ ان کی یہ علمی و تاریخی تحقیق‘ مسند ظفر علی خان‘ پنجاب یونیورسٹی لاہور‘ کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں سے ’’مشتے از خروارے‘‘ کے مصداق ایک مکتوب نقل کیا جارہا ہے جو مولانا نے اپنی ہمشیرہ کے نام تحریر کیا تھا:

کرم آباد۔ ۱۳/مارچ ۱۹۱۸ء

میری پیاری بہن

جب تک اخبار نویسی زنجیر پا[1] تھی اور اس کے گوناگوں مشاغل سنگِ راہ تھے‘ خط لکھنا میرے لیے مشکل تھا‘ لیکن اب تو میں ہوں اور نامہ نگاری ہے اور تم ہو۔ مگر لکھوں کیا؟ یہی چاہتا ہوں کہ جیسا میں ہو چلا ہوں ویسی ہی تم بھی بن جاؤ۔

میں کیا ہو چلا ہوں؟ سنو! چار بجے صبح کے آنکھ کھلتی ہے جبکہ آسمان پر تارے پھیکے ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور چاند بھی چمک رہا ہوتا ہے بشرطیکہ اس کا چمکنے کا اور اس وقت آسمان پر موجود ہونے کا زمانہ ہو۔

آں سحر خیزم کہ مہ را در شبستاں دیدہ ام

اٹھتا ہوں اور وضو کرکے تہجد پڑھتا ہوں کہ یہ رسول اللہ ﷺ ہمارے آقا و مولا‘

ہماری نجات کے کفیل، ہمارے دین و دنیا کی آنکھوں کے تارے کی سنت ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ ① قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا ②﴾ (المزمل) (۲)

نوافل سے فارغ ہو کر قرآن پڑھتا ہوں اور بڑے بڑے اسرار و معارف کے دروازے مجھ پر کھلتے ہیں۔ کسی دن بتاؤں گا کہ کیسے کیسے اشارے، اس عالمِ قدس میں، مجھے ہوئے ہیں اور کیسی کیسی سچی بشارتیں ان واقعات کے متعلق، جو پیش آ رہے ہیں اور پیش آنے والے ہیں اور جنہیں میں ان اپنی آنکھوں سے اسی طرح دیکھ رہا ہوں جس طرح روزِ روشن میں آفتابِ عالم تاب کو مطلعِ فلک پر، مجھے ہوئے ہیں۔ اتنے میں نمازِ فجر کا وقت آ جاتا ہے۔ نماز پڑھتا ہوں اور پھر تھوڑی دیر کے لیے سو رہتا ہوں۔ پھر اٹھتا ہوں اور تھوڑی سی ورزش کر کے غسل کرتا ہوں۔ اتنے میں چائے آ جاتی ہے۔

چائے پی کر باہر نکلتا ہوں اور خدا کی قدرتوں کے جلوے میری نگاہ کے سامنے ہوتے ہیں۔ ظہر، عصر، مغرب، عشاء کا وقت پے بہ پے آتا ہے اور مجھے توفیق دی جاتی ہے کہ حضرت باری عز اسمہ کے آستانۂ جلال پر اپنی جبینِ نیاز کو رکھوں اور اس سے گڑگڑا گڑگڑا کر وہ دعائیں مانگوں جو ایک مسلمان کے دل کی عزیز ترین تمنائیں ہیں۔ رات آتی ہے، نمازِ عشاء کے بعد کھانا کھاتا ہوں اور بستر پر جا دراز ہوتا ہوں۔ سامنے کوئی کتاب ہوتی ہے، اسے پڑھتے پڑھتے آنکھ لگ جاتی ہے اور عالمِ خواب میں ایک سہانی دنیا، تخیل کی سامنے آ جاتی ہے اور اچھے اچھے خواب دکھائی دیتے ہیں۔

یہ ہے میری زندگی کی ایک مختصر سی روزانہ روئداد۔

تم کو جو مجھے بہت ہی عزیز ہو، میں ایسا ہی دیکھنا چاہتا ہوں اور تمہارے بچوں کو بھی جو مجھے اختر (۳) کی طرح عزیز ہیں میں ایسا ہی دیکھنا چاہتا ہوں۔

تہجد شاید تم نہ پڑھ سکو کہ

﴿اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیْلِ ھِیَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِیْلًا ⑥﴾ (المزمل) (۴)

رات کا اٹھنا عبادت باری کے لیے مشکل اور دقت طلب ہے، لیکن پانچ وقت کی نماز اور قرآن فجر جس کی نسبت ”کَانَ مَشْھُوْدًا“ (۵) قرآن کریم میں آیا ہے، کچھ مشکل نہیں۔ اس پر التزام کے ساتھ عامل ہو اور خورشید اور زبیدہ (۶) کو بھی اس کا عادی بناؤ۔ بچپن میں جو عادتیں پڑ جاتی ہیں فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہیں اور آخر وقت تک ساتھ دیتی ہیں۔ یہ عادتیں ان میں ڈالو گی تو خداوند کریم جنت الفردوس میں تمہیں اور انہیں جگہ دے گا۔

رضیہ اور مہ لقا (۷) بھی بہت زیادہ کم سن ہیں لیکن انہیں ابھی سے نماز کا پابند



بنانے کی کوشش کرو۔ آفتاب (۸) تمہارے پاس نہیں رہتا۔ تربیت اس کی بھائی فیروز اچھی طرح کر رہے ہیں لیکن نماز پڑھتے میں نے اسے نہیں دیکھا۔ انہیں لکھ بھیجو کہ اسے پابندِ صلوٰۃ بنائیں۔

باقی خاندان کے سب لوگوں پر بھی تمہارا ایک خاص اثر ہے۔ کیوں نہ اس اثر سے کام لو اور ان کے کان میں یہ باتیں اٹھتے بیٹھتے ڈالا کرو۔

اس وقت صرف اسی قدر۔ باقی پھر

ظفر

## حواشی

(۱) مولانا کی اخبار نویسی کا آغاز ان کے اوائل شباب ہی سے ہو گیا تھا۔

(۲) ”اے کپڑے میں لپٹنے والے! رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم۔“

(۳) مولانا ظفر علی خان کے فرزند مولانا اختر علی خان (۶/دسمبر۱۸۹۴ء......۱۷/اکتوبر۱۹۵۸ء)

(۴) ”البتہ اٹھنا رات کو سخت روندتا ہے (نفس کو) اور سیدھی نکلتی ہے بات (دل سے)“

(۵) ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ⑧﴾ (بنی اسرائیل) ”قائم رکھ نماز کو سورج ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک اور قرآن پڑھنا فجر کا۔ بے شک قرآن پڑھنا فجر کا ہوتا ہے روبرو“۔ (ترجمہ شیخ الہند) مولانا عثمانی نے آیت کے آخری حصے کی تفسیر میں لکھا ہے:

”حدیث میں ہے کہ فجر و عصر کے وقت دن اور رات کے فرشتوں کی بدلی ہوتی ہے، لہٰذا ان دو وقتوں میں لیل و نہار کے فرشتوں کا اجتماع ہوتا ہے تو ہماری قراءت اور نماز ان کے روبرو ہوئی جو مزید برکت و سکینہ کا موجب ہے اور اس وقت اوپر جانے والے فرشتے خدا کے ہاں شہادت دیں گے کہ جب گئے تب بھی ہم نے تیرے بندوں کو نماز پڑھتے دیکھا اور جب آئے تب بھی۔ اس کے علاوہ صبح کے وقت یوں بھی آدمی کا دل حاضر اور مجتمع ہوتا ہے“۔ (تفسیر عثمانی، طبع سعودی عرب، ص ۳۸۵)

(۶) مکتوب الیہا شہزادہ بیگم کی بیٹیوں کے نام: خورشید (۲۵/دسمبر۱۹۰۳ء......۱۷/اکتوبر۱۹۹۸ء) بعد ازاں مولانا کے بیٹے اختر علی خان کے عقد میں آئیں اور زبیدہ نے کم سنی میں ۱۳/نومبر ۱۹۱۸ء کو انتقال کیا۔

(۷) یہ بھی مکتوب الیہا کی تیسری اور چوتھی بیٹیوں کے نام ہیں۔

(۸) مکتوب الیہا کا بیٹا۔

❁❁❁

# میرے والدِ گرامی

تحریر: عامر عتیق صدیقی ☆

والد گرامی عتیق الرحمان صدیقی ۴ ستمبر ۲۰۱۴ء بروز جمعرات ہمیں سوگوار چھوڑ کر ۶۷ برس کی عمر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون —— دسمبر ۱۹۹۸ء میں بطور پرنسپل ریٹائر ہوئے۔ ۴۳ سال تک صوبے کے مختلف تعلیمی و تدریسی اداروں میں متعدد حیثیتوں سے تدریسی و انتظامی فرائض انجام دیے۔ ملازمت کا زیادہ حصہ گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن فار ایلیمنٹری ٹیچرز ہری پور میں گزارا۔ اس دوران تربیتِ اساتذہ و نصاب سازی کے حوالے سے ملکی و غیر ملکی پراجکٹس میں بھی کام کیا اور پیشہ ورانہ بہتری اور فکری و نظریاتی حوالوں سے اپنا کردار ادا کیا۔ وقت کی پابندی‘ ڈسپلن‘ قانون کا احترام‘ اپنی ذمہ داریوں اور فرائض سے آگاہی‘ قول و فعل میں یکسانیت‘ اپنے منصب کے وقار کا لحاظ‘ مسلسل مطالعہ‘ گردوپیش سے باخبر‘ پیشہ ورانہ اور نت نئی تعلیمی و تدریسی مہارتوں وتکنیکوں سے آگاہی ایک استاد کے لئے ضروری تصور کرتے تھے۔

ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بارے میں کہا کرتے کہ یہ زندگی سے ریٹائر ہونا نہیں ہے۔ ایک بندۂ مؤمن کبھی ریٹائر نہیں ہوتا‘ وہ اپنے حصے کا کام کرتا چلا جاتا ہے۔ آپ کے یہی جملے آپ کی زندگی کے مصداق تھے۔ مدتِ ملازمت کی تکمیل کے بعد باقاعدگی سے قومی اخبارات ورسائل میں دینی‘ سیاسی‘ سماجی‘ تعلیمی اور اصلاحی موضوعات پر لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ قرآن و حدیث‘ لٹریچر اور اخبارات ورسائل کا مسلسل مطالعہ اُن کا معمول تھا۔ ۱۹۸۵ء سے علالت (۲۰۱۴ء) تک ایلیمنٹری کالج ہری پور کی مسجد میں فی سبیل اللہ خطابت کی ذمہ داریاں نبھائیں۔ تحریکی حلقوں اور پروگرامات میں دروسِ قرآن اور دوسرے موضوعات پر تقاریر کرتے جو دل کو موہ لینے والی‘ مخاطبین کو متوجہ کرنے والی‘ ادبی حسن سے مرقع اور فکری گہرائی و گیرائی سے لبریز ہوتیں۔ مسلکی و فروعی اختلافات اُن کا موضوع نہ ہوتے‘ مشترکات کو بنیاد بناتے تا کہ اتفاق واتحاد کو فروغ ملے اور دین کو بطور نظامِ زندگی سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کا احساس جاگزیں ہو۔ اس دوران آپ کی تحریر کردہ

☆ ماہر مضمون ادارۂ نظامت نصاب وتربیت اساتذہ‘ خیبر پختون خوا‘ ایبٹ آباد



سات کتب: نقوشِ سیرت ﷺ‘ چراغِ مصطفوی ﷺ‘ شوقِ حرم‘ پھول پھول خوشبو‘ آدابِ خود آگاہی‘ خیالوں کی مہک‘ اور تعلیمی مباحث منظر عام پر آئیں جن پر متعدد قومی اخبارات وجرائد میں تبصرے شائع ہوئے۔

آپ ایک باعمل‘ سچے اور دوٹوک مسلمان تھے۔ اپنے شاگردوں اور اولاد کی تعلیم وتربیت میں یکساں فکر کے حامل تھے۔ وہ کہتے کہ تعلیم انسان کا زیور ہے اور یہ جتنی اچھی اور زیادہ ہو ایک انسان کے لئے اعزاز کا باعث ہے۔ مذاق میں بھی جھوٹ نہ کہتے اور گالی بکنا بہت برا تصور کرتے۔ آپ کہتے کہ اولاد انتہائی قیمتی متاع ہے۔ والدین جہاں اُن کی جسمانی ضرورتوں اور خواہشوں کا اہتمام کرتے ہیں وہاں اُن کی روحانی وفکری غذا اور تربیت کا بندوبست کرنا اُن پر لازم ہے‘ جبکہ اساتذہ اس انداز میں اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوں کہ نونہالانِ قوم کے اندر غور وفکر‘ تحقیق وجستجو اور تنقیدی نکتہ نگاہ پروان چڑھے‘ وہ دورِ حاضر کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوں اور فکری ونظریاتی اعتبار سے اپنی شناخت رکھتے ہوں۔

راقم الحروف جب پرائمری کا طالب علم تھا تو اس دوران ایک دفعہ والد گرامی (جو اُس وقت ہاسٹل سپرنٹنڈنٹ کی اضافی ذمہ داری نبھا رہے تھے) کے ساتھ شام کو ایلیمنٹری کالج کے دار الاقامہ برائے طلبہ گیا دفتر سے والد صاحب کسی کام کے سلسلے میں اُٹھ کر باہر چلے گئے۔ میز پر نیلی/سرخ سیاہی وقلم وغیرہ پڑے تھے۔ راقم نے اپنی جیب سے قلم نکالا اور میز پر رکھی دوات سے سیاہی بھرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد والد صاحب تشریف لائے اور پوچھا: کیا کر رہے ہو؟ راقم نے عرض کیا کہ قلم میں سیاہی نہ تھی‘ یہاں سے ڈال لی ہے تو انہوں نے فوراً کہا کہ یہ ہماری نہیں‘ سرکاری ہے۔ یہاں کا کام میں اس سے کرتا ہوں‘ آپ فوراً سیاہی واپس دوات میں ڈال دیں اور صحن میں جا کر پانی والے نلکے سے قلم دھو کر آئیں۔

اسی طرح علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے بی ایڈ کرنے کے دوران ایک دفعہ راقم کا نام والد محترم (ٹیوٹر) کے پاس آ گیا تو آپ نے وقت مقررہ پر مشق دینے کو کہا۔ راقم نے پانچ میں سے چار سوالات حل کر کے والد صاحب کو مشق جمع کرا دی۔ ان دنوں مشق جمع ہونے کے ۱۵ دن بعد رزلٹ یونیورسٹی روانہ کیا جاتا تھا۔ والد صاحب نے راقم کو کہا کہ وہ رزلٹ کل بھجوا رہے ہیں‘ لہٰذا باقی ماندہ سوال کا جواب رات تک انہیں جمع کروا دیا جائے۔ راقم کی کسی مصروفیت کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا تو والد گرامی نے کسی بات کی پرواہ کیے بغیر ۸۰ نمبروں میں سے رزلٹ بنا کر بھیج دیا اور ہمیشہ اس پر اطمینان کا اظہار کیا۔

(باقی صفحہ 97 پر)

# ذُوالقرنین‘ سدِّ ذُوالقرنین اور — یاجوج ماجوج (۲)

شاہین عطر جنجوعہ☆

میں اپنی تحقیق سے جس نتیجے اور حل پر پہنچا ہوں‘ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے دو ہزار سال قبل‘ دوسرے لفظوں میں 2000 سال ق م آرمینیا سے بھی شمال میں Black Sea اور Caspian Sea کے درمیانی علاقے‘ کاکیشیا سے قریب کے علاقے میں Indo-European زبان (یہ زبان آریائی ‘Aryan بھی کہلاتی ہے۔ اس سے ایک طرف مغرب میں یورپ کی جرمانی‘ اطالوی زبانیں وغیرہ وجود میں آئیں اور دوسری طرف مشرق میں سنسکرت وغیرہ) بولنے والے افراد کا ایک گروہ جنہوں نے بعد میں حتّی (Hittetos) کا نام پایا‘ مغرب کی طرف سفر کرتے ہوئے موجودہ ترکی کے علاقے میں آباد ہوگئے۔ اس قوم نے ترکی کے ایک وسطی علاقے میں سے شروع کر کے آہستہ آہستہ موجودہ ترکی کے علاقے پر بالادستی اور حکومت حاصل کر لی۔ وسطی علاقے میں انہوں نے Hattusalis جو ترکی کے موجودہ شہر Bogyzoky کے مقام پر ہے‘ پر دارالحکومت بنایا اور پھر وہاں سے اپنے مغرب میں ترکی کے باقی ماندہ علاقے کو فتح کر لیا اور مغرب میں موجود سمندری پانیوں پر ان کی سلطنت کی سرحد بن گئی۔ ان کے اس عروج اور توسیع کو مغرب کی طرف ان کی پہلی مہم کہا جا سکتا ہے۔ اس گروہ کی قائم کردہ اس سلطنت کو ’’حتی‘‘ کہا جانے لگا۔ اس قوم کو 1785 ق م میں عروج حاصل ہوگیا۔ ان کو جب وہاں پر پہلے سے موجود لوگوں (قوم) پر غلبہ حاصل ہوا تو انہوں نے وہاں کے مقامی لوگوں کے تمام خداؤں کو جائز خدا تسلیم

☆ ’’بحث ونظر‘‘ کے عنوان سے شائع شدہ مضامین کے مندرجات سے ادارۂ میثاق کا اتفاق ضروری نہیں۔
وضاحت طلب امور کے لیے صاحب مضمون سے رابطہ کیا جا سکتا ہے: (فون: 03345080530)



کیا اور ان پر کسی قسم کا جبر نہیں کیا۔ ان کا اپنا محبوب خدا ’’سورج دیوتا‘‘ تھا جس کو علامتاً بیل کے ’’دوسینگوں‘‘ پر دھرا دکھایا جاتا۔ آثارِ قدیمہ میں باقی ماندہ آثار کے تجزیے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ ان کی زندگی میں بھی مذہبی رسومات تھیں‘ جس میں ’’بیل‘‘ یا اس کے ’’دوسینگ‘‘ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ ان کے آبادکاری کے مقامات سے ایسے برتن ملے ہیں جن میں بیل کے ’’دوسینگ‘‘ یا ’’بارہ سنگے‘‘ کے دوسینگ بھی برتن کے ساتھ ڈھالے/بنائے گئے ہیں۔

آثار میں ملنے والے حتی برتن

سینگوں کو انہوں نے اپنے مقدس مقامات میں کندہ تصاویر میں منقش بھی کیا ہے اور پتھر کے بنے سینگ بھی اپنی عبادات میں علامتاً استعمال کرتے تھے۔ میرے خیال میں ان کا بیل یا بیل کے سینگوں کو مذہبی عبادت میں استعمال کرنا ان لوگوں کا ’’سینگوں والے‘‘ کے طور پر مشہور ہو جانے کا سبب بنا ہوگا۔ یہ شہرت‘ اور ظاہر ہے میری مراد سلطنت کی شہرت‘ اس کی توسیع کی وجہ سے اطراف وجوانب میں پھیلی تو کنعان کے علاقے میں رہنے والے یہودیوں نے بھی ان کو ’’سینگوں والے‘‘ کے طور پر یاد کرنا شروع کر دیا ہوگا اور دوسینگ کی علامت یہود کے اجتماعی حافظے میں کہیں اٹکی رہ گئی ہوگی۔ اس ایک لفظ کو انہوں نے حضور ﷺ سے ’’ذوالقرنین‘‘ کے سوال کی صورت میں پوچھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس انڈو یورپین نسل کا (یعنی حتیوں کا) مغرب کی طرف سفر اور عروج جو ترکی کی مغربی سرحد تک پہنچا‘ جہاں سمندر ہے‘ جہاں اُس (حتیوں) نے سورج کو کالے پانی میں ڈوبتے دیکھا ذوالقرنین کا مغرب کی طرف پہلا سفر ہے۔ قرآن کا یہ کہنا کہ ﴿وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ حَمِئَةٍ﴾ ’’سورج کو گدلے پانی میں ڈوبتے دیکھا‘‘ پہلا

اشارہ ہے جو حتیوں کی مغرب کی طرف توسیع سے مطابقت رکھتا ہے‘ اور قرآن کا یہ کہنا کہ ﴿وَجَدَ عِنۡدَهَا قَوۡمًا﴾ ’’وہاں اس کو ایک قوم ملی‘‘ میرے نزدیک ایک اور دلچسپ نکتہ ہے۔ قرآن یہ نہیں کہہ رہا کہ اُس نے قوم فتح کی بلکہ یہ کہہ رہا ہے کہ ’’قوم ملی‘‘۔ اور تاریخ یہی بتاتی ہے کہ حتیوں نے ترکی کے علاقے میں آبادکاری کے لیے فوجی یلغار نہیں کی اور نہ عروج حاصل کرنے کے لیے کوئی اندرونی قتل و غارت کی بلکہ ’’موجود قوم‘‘ میں آہستہ آہستہ عروج حاصل کر لیا۔ ذوالقرنین (یعنی حِتّیوں) کا وہاں کی قوم کو نہ کچلنا بلکہ ان میں شامل ہو کر آہستہ آہستہ بالادستی حاصل کرنا اور ان کے معبودان کو جائز تسلیم کرنا ذوالقرنین (حتیوں) کی مذہبی رواداری اور عدل کا نمونہ ہے۔ آثارِ قدیمہ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ذوالقرنین (حتیوں) نے قوانین بھی نافذ کیے اور عدل سے کام لیا۔ میرے خیال میں قرآن کریم میں مذکور ذوالقرنین کے مندرجہ ذیل الفاظ میں حتیوں کی اسی مذہبی رواداری کی طرف اشارہ ہے۔

﴿قَالَ اَمَّا مَنۡ ظَلَمَ فَسَوۡفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ یُرَدُّ اِلٰی رَبِّهٖ فَیُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكۡرًا ﴿۸۷﴾
وَاَمَّا مَنۡ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ۨالۡحُسۡنٰی ۚ وَسَنَقُوۡلُ لَهٗ مِنۡ اَمۡرِنَا یُسۡرًا ﴿۸۸﴾﴾

’’اُس نے کہا: ان میں سے جو بے انصافی کرے گا تو ہم اس کو سزا دیں گے‘ پھر وہ اپنے رب کی طرف پلٹایا جائے گا اور وہ اسے اور زیادہ سخت عذاب دے گا۔ اور جو اُن میں سے ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا‘ اس کے لیے اچھی جزا ہے اور ہم اس کو نرم احکام دیں گے۔‘‘

یہاں فطری اور انتہائی اہم سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے کہ ’’ذوالقرنین‘‘ کے لفظ کو ایک ’’قوم‘‘ کے لیے کیوں کر منطبق تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ پہلی بات یہ کہ قرآن حکیم میں قرآن ہی کے لیے ذِکۡرٌ لِّلۡعٰلَمِیۡنَ اور ذِكۡرٰی لِلۡعٰلَمِیۡنَ، جبکہ حضور ﷺ کے لیے رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اب عالم کا مطلب تو ’’جہان‘‘ ہوتا ہے اور لفظی ترجمہ کریں تو مندرجہ بالا مرکبات کا مطلب بالترتیب بنتا ہے ’’جہانوں کے لیے ذکر‘‘ اور ’’جہانوں کے لیے رحمت‘‘۔ اب ’’جہانوں‘‘ کو تو کسی ’’ذکر‘‘ یا ’’رحمت‘‘ کی ضرورت نہیں‘ بلکہ وہ تو انسانوں یعنی ’’جہان والوں‘‘ کو ضرورت ہے۔ اس لیے علماء کے نزدیک ’’جہانوں کے لیے ذکر‘‘ سے یہاں مراد ’’جہان والوں کے لیے ذکر‘‘ ہے۔ قرآن حکیم میں رسولوں کا انکار کرنے کے جرم میں ہلاک ہونے والی قوموں میں سے ہر ایک کے بارے میں یہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے کہ



انہوں نے رسولوں کا انکار کیا‘ حالانکہ ہر قوم نے صرف اُس رسول کا انکار کیا تھا جو اس کی طرف مبعوث کیا گیا۔ مثلاً: ﴿كَذَّبَتۡ قَوۡمُ نُوۡحِ ۣالۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۱۰۵﴾﴾ (الشعراء) ’’نوحؑ کی قوم نے رسولوں کا انکار کیا‘‘۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قوم کے سامنے تو صرف ایک رسول حضرت نوح علیہ السلام پیش ہوئے اور اس نے تو صرف (ایک) ’’رسول‘‘ کا انکار کیا ’’رسولوں‘‘ کا تو نہیں۔ علماء نے لکھا ہے کہ قرآن کے فلسفے کی رو سے اور منطقی طور پر ایک رسول کا انکار کرنا گویا سارے رسولوں کا انکار ہے۔ ان مثالوں سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ’’ذوالقرنین‘‘ سے ’’ذوالقرنین والوں‘‘ یعنی سینگوں والوں یعنی حتی قوم مراد لے لیا جائے تو یہ قرآن کے انداز و اسلوب‘ معانی آفرینی اور تعلیم سے متغائر نہیں۔

پھر اپنی سلطنت کے استحکام اور توسیع ہی کے سلسلے میں وہ مشرق اور جنوب مشرق کی طرف بڑھے۔ مشرق میں دجلہ اور فرات دریاؤں کے آغاز کے علاقے اور جنوب مشرق میں شام اور کنعان کے علاقوں تک وہ پہنچے۔ اس سے آگے ان کی سلطنت نہیں گئی۔ ذوالقرنین کی دوسری مہم‘ جو اُس نے مشرق کی طرف کی‘ میرے نزدیک حتیوں کی مشرقی فتوحات کے نتائج پر منطبق ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ قرآن حکیم میں بتایا گیا ہے کہ مشرق میں ذوالقرنین وہاں پہنچا جہاں اس کو ایسے لوگ ملے جن کو ’’سورج سے کوئی آڑ نہیں تھی‘‘۔ بعض علماء نے اس سے یہ مراد لی ہے کہ وہ اتنے غیر مہذب تھے کہ گھر بنانا نہیں جانتے تھے‘ مثلاً ایران کے مشرق میں مکران کے علاقوں کے غیر مہذب لوگ۔ لیکن میرے خیال میں ’’انہیں سورج سے کوئی آڑ حاصل نہیں تھی‘‘ کا سادہ اور صاف سا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسا مقام تھا جہاں سورج سے کوئی قدرتی اوٹ یعنی درخت‘ پہاڑ یا اونچے پتھریلے ٹیلے وغیرہ نہیں تھے۔ اب حتیوں کی سلطنت کا نقشہ دیکھا جائے تو اس کے مشرق میں دجلہ و فرات کے اردگرد کی بے اشجار‘ بے بن و کہسار‘ چٹیل‘ ہموار زمین ہے جہاں پر سورج بالکل سر پر کھڑا معلوم ہوتا تھا اور جنوب مشرق سارا عرب کا صحرا تھا۔ تو قرآن میں مذکور دوسرا اشارہ بھی ’’حِتی سلطنت‘‘ کی مہم پر منطبق معلوم ہوتا ہے۔

حتیوں کا مشرق میں مزید پیش قدمی نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ انہیں مشرقِ ’’بعید‘‘ کے جغرافیے کی خبر تھی۔ قرآن کا یہ کہنا کہ:

﴿وَقَدۡ اَحَطۡنَا بِمَا لَدَیۡهِ خُبۡرًا ﴿۹۱﴾﴾

’’اور ہمارے قابو میں آ چکی ہے اس کے پاس کی خبر۔‘‘

بھی ایک دلچسپ نکتہ ہے‘ یعنی ان کو پہنچنے والی خبروں (اطلاعات) کا اللہ کو علم ہے۔

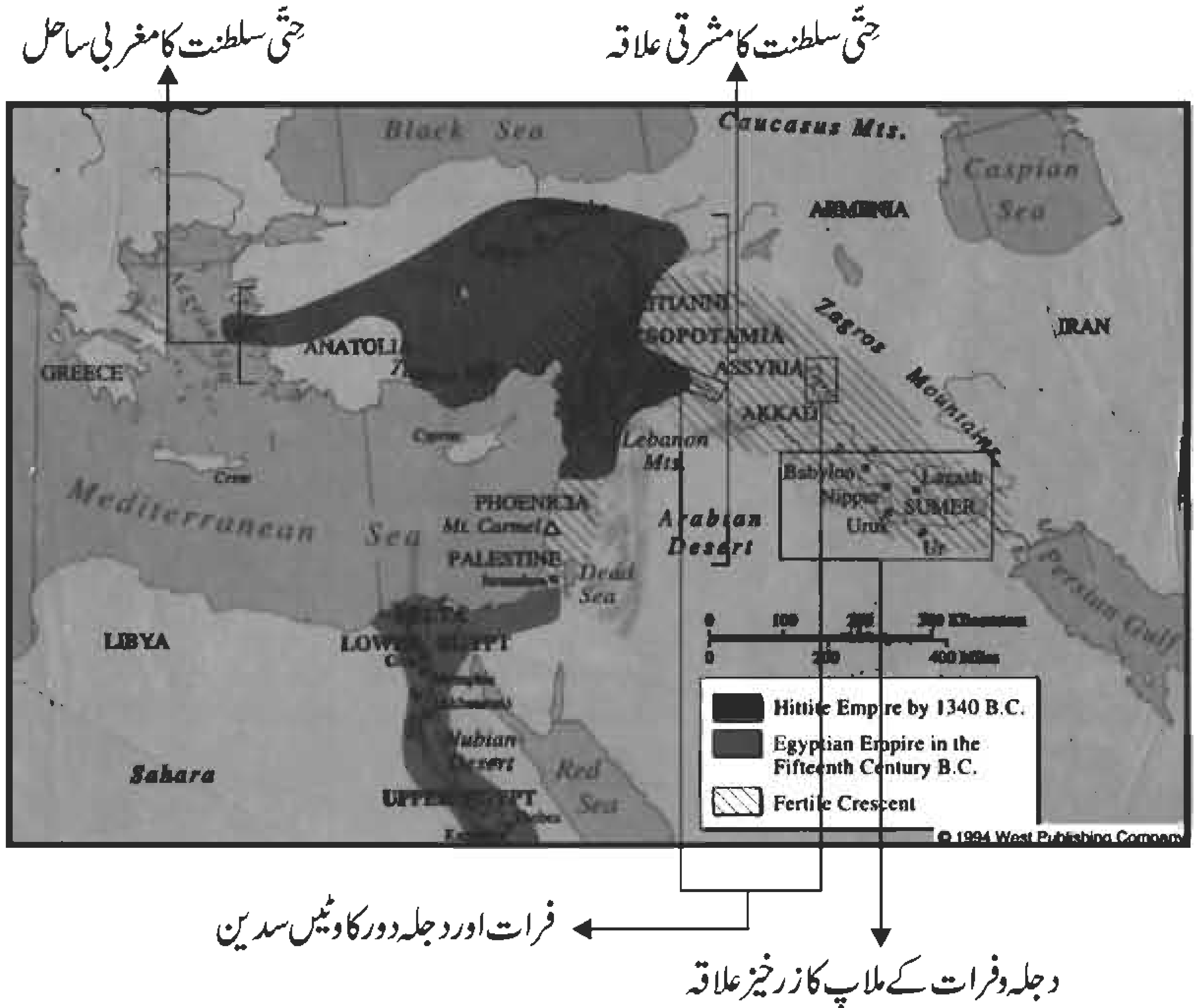


اب اس قصے میں ذوالقرنین (حتیوں) کی تیسری مہم کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں جس کی توضیح اور تشریح پورے قصے میں انتہائی مشکل رکاوٹ ہے۔ بالعموم اس سے یہ مراد لی گئی ہے کہ شمالی نصف کرۂ زمین کے وحشی قبائل کو روکنے کے لیے کوئی دیوار تعمیر کی گئی تھی۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا اس کے تاریخی‘ اشاریاتی اور منطقی ثبوت نہیں مل سکے‘ لہٰذا غیر اغلب ہے کہ یہ دیوار تعمیر ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ حتیوں (ذوالقرنین) کی تاریخ سے تیسری مہم کا ثبوت ملتا ہے اور میرے نزدیک یہ ثبوت سب سیقوی ثبوت ہے میری اس رائے کا‘ کہ حتی قوم (دو سینگوں والے) ہی دراصل ذوالقرنین ہیں۔

قرآن کی رو سے ذوالقرنین دو رکاوٹوں کے درمیان (بَیۡنَ السَّدَّیۡنِ) پہنچا۔ وہاں اس کو ایک قوم ملی جو کوئی بات نہیں سمجھ سکتی تھی۔ اس نے ذوالقرنین سے کہا کہ یاجوج ماجوج زمین میں فساد مچائے رکھتے ہیں تو کیا آپ ہمارے لیے کوئی رکاوٹ بنا سکتے ہیں ان سے بچنے کے لیے؟ ذوالقرنین نے ان کے لیے لوہے کی چادروں (زُبَرَ الۡحَدِیۡدِ) اور پگھلے ہوئے تانبے (قِطۡر) سے ایک دیوار بنا دی جس کو یاجوج ماجوج نہ عبور کر سکتے تھے اور نہ گرا سکتے تھے۔

قرآن نے دو رکاوٹوں کا ذکر کیا ہے‘ پھر ان سے پرے ایک قوم کا۔ لیکن اس مہم کی سمت



کا ذکر نہیں کیا۔ اس لیے یہ ضروری نہیں کہ (i) یہ مہم حقیقتاً مہم ہی ہو‘ یعنی مرکز سے باہر کسی سمت سفر۔ (ii) یہ مہم مشرق اور مغرب کی مہمات کے بعد مذکور ہونے کی وجہ سے شمال یا جیسا کہ سمجھا گیا ہے جنوب کی طرف ہو۔ لہٰذا اس کو بغیر سمت کے مہم یا دوبارہ مشرق یا مغرب کی طرف مہم سمجھنے میں کوئی رکاوٹ نہیں‘ بلکہ میرے نزدیک سمت کا ذکر نہ ہونے کی وجہ سے یہی اغلب ہے کہ اس کو فوجی حرکت والی مہم نہ سمجھا جائے۔

میرے نزدیک ’’دو رکاوٹیں‘‘ حتیوں کی سلطنت کے مشرق میں دریائے دجلہ وفرات کی رکاوٹیں ہیں۔ حتیوں کے علاقے ’موجودہ ترکی‘ کے مشرق میں دریائے دجلہ وفرات کے منابع تھے‘ لیکن یہ دونوں آپس میں فاصلے پر ہیں۔ یہ دریا مشرق کی سرزمین موجودہ عراق میں بہتے ہیں اور ان کے درمیان فاصلہ کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ دونوں قریب آتے ہیں اور موجودہ عراق کے مشرق میں کویت کے قریب آپس میں مل جاتے ہیں۔ جیسے ہمارے یہاں سندھ‘ جہلم‘ چناب دریاؤں وغیرہ کی ابتدا کشمیر کے علاقے میں سینکڑوں کلومیٹر ایک دوسرے سے دور دور ہوتی ہے لیکن بہتے بہتے‘ جنوبی پنجاب کے علاقے میں یہ جا ملتے ہیں‘ بالکل ایسے ہی تقریباً 1500 ق م میں حتیوں کے عروج کے زمانے‘ بلکہ اس سے بھی کہیں ہزار سال پہلے سے اب تک دجلہ و فرات کا یہی روٹ تھا اور ہے۔

دجلہ اور فرات کے درمیان کا علاقہ Mesopotamia (دو دریاؤں کے درمیان کا علاقہ) کہلاتا ہے۔ عراق کے جنوب میں جہاں دونوں دریا ملتے ہیں وہاں انسان نے آباد کاری کی زندگی شروع کی۔ 2000 ق م کے قریب کے زمانے میں جنوبی اور وسطی عراق میں بہت سی چھوٹی بڑی‘ ایک شہری بھی اور کئی شہروں پر مشتمل‘ سلطنتیں قائم تھیں‘ مثلاً مشہور و معروف اشوری سلطنت جس کا صدر مقام ’’اشور‘‘ تھا۔

میرے نزدیک قرآن کا یہ کہنا کہ انہیں دو رکاوٹوں سے پرے لوگ ملے جو ان کی بات نہیں سمجھتے تھے جنوبی عراق کے یہی علاقے تھے جو دجلہ وفرات کے اردگرد‘ یعنی حتیوں کے لیے دریاؤں کے پرلی طرف تھے۔ حتیوں کی زبان وہ نہیں سمجھ سکتے تھے۔ ﴿لَا یَکَادُوۡنَ یَفۡقَہُوۡنَ قَوۡلًا ﴿۹۳﴾﴾

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے‘ حتی قوم کے اولین آباء و اجداد اور کاکیشیا (Cacacia) کے قرب وجوار سے آنے والے آریائی (Indo-European) زبان بولنے والی قوم تھے۔ کیونکہ وہ ہجرت کر کے آئے تھے اور اپنی زبان ساتھ لائے تھے‘ لہٰذا ان کی سلطنت میں وہی زبان رائج ہوگئی تھی۔ دوسری طرف Mesopotamia (دجلہ وفرات کا دوآبہ) کے علاقے

میں سمیری زبان بولی جاتی تھی۔ اس لیے حتیوں اور عراقیوں کی زبان ایک دوسرے کے لیے انجانی تھی۔ لیکن دو الفاظ اور ان کی معنویت حتیوں کو سمجھ آ گئی اور وہ تھی یاجوج وماجوج کا فساد۔ جیسا کہ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں' اقبال نے اپنی نجی گفتگو میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی سے کہا تھا کہ یاجوج ماجوج عربی زبان کے الفاظ نہیں بلکہ سمیری زبان کے الفاظ ہیں جن کا مطلب ہے جاگیردار اور ہاری/ کاشت کار۔ تو حقیقت بھی یہی ہے کہ آثارِ قدیمہ کے مطالعے سے پتہ چلا ہے اور ظاہر ہے علامہ اقبال کو بھی اسی تحقیق کے مطالعے سے علم ہوا ہوگا کہ میٹ گاگ (Matgog) سے مراد تھا زمین کا مالک یعنی جاگیردار۔ دوسری طرف گاگ (gog) سے مراد تھا بے زمین' یعنی کاشت کار۔ ان دو گروہوں میں فساد مچا رہتا تھا۔ قرآن نے گاگ میٹ کی لڑائیوں کے لیے ''یاجوج ماجوج'' اور فساد کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یعنی سمیری الفاظ کو عربی کے الفاظ میں ڈھال کر استعمال کیا:

﴿قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰٓى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ﴿٩٤﴾﴾

''بولے اے ذوالقرنین! یہ یاجوج ماجوج دھوم اٹھاتے ہیں ملک میں' سو کہے تو ہم ٹھہرا دیں تجھ کو کچھ محصول اس پر' کہ بنا دے تو ہم میں اور ان میں ایک آڑ۔''

یاجوج ماجوج کے فساد سے بچنے کے لیے ذوالقرنین (حتیوں) نے سد تعمیر کی۔ اب پہلے سمجھتے ہیں کہ یاجوج ماجوج کے فساد سے کیا مراد ہے اور اس سے حتیوں کو کیا خطرہ تھا اور انہوں کیا دیوار تعمیر کی؟ (جاری ہے)

---

بقیہ: میرے والدِ گرامی

آپ میرٹ اور عدل وانصاف کے اُصولوں پر اپنے پرائے سب کے ساتھ یکساں سلوک کرتے۔ بات ہمیشہ نپی تلی اور سلیقے سے کرتے اور سخت بات بھی اس انداز سے کرتے کہ مخاطب کو بُری نہ لگتی اور اسے اپنی غلطی وکمزوری کا احساس بھی ہو جاتا۔ خودداری' وضع داری اور دوسروں کی عزتِ نفس کا احساس آپ کی شخصیت کے نمایاں پہلو تھے۔ صاف ستھرا اور باوقار لباس زیب تن کرتے تھے۔

آج وہ ہمارے درمیان نہیں' لیکن اُن کی دی ہوئی تربیت' تعلیمات' وعظ ونصیحت اور بیش بہا تحریریں ہمارا حقیقی ورثہ اور اثاثہ ہیں —— اللہ کریم انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور اُن کی مغفرت کرے اور ہمیں اُن کے فکری ورثے کا امین ہوتے ہوئے یہ توفیق دے کہ معرکۂ خیر وشر میں خیر کا دامن تھامتے ہوئے اسی کے غلبے کی جدوجہد میں اپنا کردار ادا کرتے رہیں۔ آمین یا ربّ العالمین!




# قرآن فہمی بذریعہ خط وکتابت کورسز

گھر بیٹھے قرآن کی ابدی تعلیمات سے آگاہی اور عربی زبان کے بنیادی قواعد سیکھنے کا

## نادر موقع!

مرکزی انجمن خُدّام القرآن لاہور کے زیر اہتمام اپنی نوعیت کے 3 منفرد

## خط وکتابت کورسز میں داخلے جاری ہیں:

### ۱) قرآن حکیم کی فکری وعملی راہنمائی

قرآن کی ابدی ہدایت سے استفادے کے نقطۂ نگاہ سے یہ نہایت مفید اور مؤثر کورس ہے۔ اس کورس کے لیے اعانتی مواد مطبوعہ شکل میں بھی دستیاب ہے' اور کمپیوٹر CD کی صورت میں بھی۔

### ۲) عربی گرامر خط وکتابت کورس (III,II,I)

قرآن وحدیث کی زبان یعنی عربی سے واقفیت کے لیے اس کے قواعد کو جاننا بہت ضروری ہے۔ عربی گرامر کورس مرکزی انجمن کی شائع کردہ کتاب آسان عربی گرامر کے تین حصوں پر مشتمل ہے۔ جس میں عربی گرامر کے تقریباً تمام ضروری قواعد کا احاطہ کیا گیا ہے۔

### ۳) ترجمہ قرآن حکیم کورس

یہ کورس خصوصی طور پر نوجوان طلبہ وطالبات کے لیے ترتیب دیا گیا ہے جنہیں قرآنی الفاظ کے معانی براہِ راست سمجھائے اور یاد کرائے جاتے ہیں اور اس طرح آیاتِ قرآنی کا مفہوم سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

داخلہ کے خواہش مند حضرات پراسپکٹس کے حصول اور دیگر معلومات کے لئے درج ذیل پتے پر رجوع فرمائیں

## ناظم شعبہ خط وکتابت کورسز

قرآن اکیڈمی' 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور' فون: 35869501-03

Email: distancelearning@tanzeem.org

Oct. 2014
Regd. CPL No. 115
vol. 63
No. 10
Monthly **Meesaq** Lahore

رسول اکرم ﷺ کی عظمت، آپ ؐ کے مقصدِ بعثت، اسوۂ رسول ﷺ کے قرآنی تصور، سیرتِ نبوی ﷺ کے مختلف گوشوں، خاص طور پر آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے انقلابی پہلو جیسے علمی وعملی موضوعات پر 9 کتابوں کا مجموعہ

# رسولِ اکرم ﷺ اور ہم

از ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ

دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ

516 صفحات پر مشتمل فکرانگیز تالیف

اشاعت خاص (مجلد):
امپورٹڈ آفسٹ پیپر، قیمت: 450 روپے

اشاعت عام (پیپر بیک):
امپورٹڈ بک پیپر، قیمت: 300 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور فون: 3-042-35869501

maktaba@tanzeem.org

- قربانی ہماری معاشرتی رسم ہے یا دینی فریضہ؟
- قرآن وسنت کی روشنی میں قربانی کا فلسفہ کیا ہے؟
- عیدالاضحیٰ اور قربانی میں باہم چولی دامن کا ساتھ کیوں ہے؟
- حج کے موقع پر منیٰ میں کی جانے والی قربانی اور اس موقع پر پوری دنیا میں کی جانے والی قربانی میں کیا ربط و تعلق ہے؟

ان سوالات کی وضاحت کے لیے مطالعہ کیجئے:

# عیدالاضحیٰ اور فلسفۂ قربانی

اور

## حج اور عیدالاضحیٰ اور اُن کی اصل روح قرآن حکیم کے آئینے میں

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کی ایک تقریر اور ایک تحریر پر مشتمل مختصر مگر جامع کتابچہ

قیمت اشاعت خاص: 45 روپے، اشاعتِ عام: 30 روپے (علاوہ ڈاک خرچ)

مکتبہ خدام القرآن لاہور 36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور فون 03-35869501

maktaba@tanzeem.org